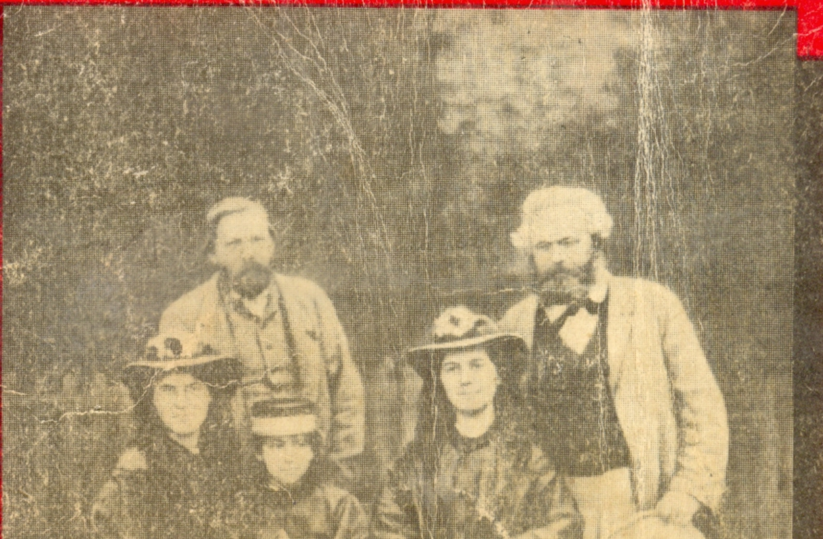

کارل مارکس

یادیں اور باتیں

کارل مارکس
یادیں
اور باتیں

کارل مارکس

یادیں اور باتیں

ترتیب

شمیم فیضی

احمد سلیم

رکتاب

پوسٹ بکس ۳۴۱۳ کراچی

پہلی بار — ۱۹۸۶ء
کتاب — کارل مارکس یادیں اور باتیں
ترتیب — شمیم فیضی، احمد سلیم
تراجم — شمیم فیضی، شمعون سلیم، صبا حیدر
ناشر — رِکتاب کراچی
پریس — احباب پرنٹرز ۴۴۳/۲ لیاقت آباد کراچی
قیمت — ۱۲ روپے

پاکستان کے محنت کشوں کے نام!

وقت انسانی نشوونما کا میدانِ عمل ہے

(کارل مارکس)

فہرست

ہمارے عہد میں مارکس کے معنی	—— احمد سلیم	۹
مارکس کے ساتھ ایک لنچ	—— ایم ای گرانٹ ڈف	۱۴
مارکس کچھ یادیں	—— پال لافارگ	۱۷
مارکس کچھ یادیں کچھ باتیں	—— ولیہلم لیبنخت	۳۶
جینی بنام مارکس (محبت نامے)	—— ————	۸۲

احمد سلیم

ہمارے عہد میں مارکس کے معنی

ALIENATION

اُس رات
خوشی میرے دل میں رو پڑی
آدھی رات کے سمے
ایک روشن سڑک کی نکڑ پر
لنگڑے فقیر کی بھوک پر ہنستے ہوئے
ہم نہیں جانتے تھے
کہ دینے والے ہاتھ، خود کتنے بھکاری ہوتے ہیں
ہم نے اسے عزت دی
بیرے سے منگوا کر فلائنگ ساسر دیئے
اور نیکی کے غرور میں کچھ پیسے بھی
وہ جانوروں جیسا کبڑا لنگڑا فقیر ہنسا
اس کے گندے پیلے دانت
میلا کیچڑ چہرہ
کچلے ہوئے اعضاء
اس کی ہنسی میں ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہے
اپنی اداسی، اپنی تنہائی سے بھاگے ہوئے ہم
بھکاریوں کے لطیفے تھوکتے رہے
اندھا دُھند بھیک پھینکتے رہے
زمین کے اس ٹکڑے پر
لاکھوں گھروں میں
مٹھی بھر آٹے کا سوال

آج بھی کتنا سوالی ہے
میری دوست ہنستے ہنستے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی
(لڑکیاں جب بہت روتی ہیں، وہ کتنا ہنستی ہیں)
بھکاری ہمارے قریب آ گیا، اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سمیت
لیکن ہماری جیپ، اس کے پاس سے بھونک کر گزر گئی
سڑکیں بہت خالی تھیں
ایک خالی سڑک دلوں میں بھی تھی
میری دوست بہت ہنس رہی تھی، اپنے آنسوؤں میں....
ہم بھکاری کے بارے میں، بدمعاشوں کے بارے میں، خوشی کے بارے
میں، محبت کے بارے میں باتیں کرتے رہے
زندگی کو برداشت کرتے رہے....
وقت کی آنکھ زخمی ہو گئی
ہم نے دل کی دھجّی سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر
اُس کی مرہم پٹّی کی
پھر ہم زور زور سے ہنسنے لگے اپنی آنکھوں میں....

اچانک مجھے محسوس ہوا
بھوک جب پیروں کے تلوؤں میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے
اور آنکھوں میں گرم سلاخ کی طرح اُترتی ہے
درد، دیوار کی صورت گرتا ہے دِلوں پر....

ہماری جیپ ایک دلدل میں پھنس گئی
جُھگیوں میں سے آدھی ننگی عورتیں اور پورے ننگے بچّے
ہمیں اُداسی سے دیکھ رہے تھے
وہ اس قدر بھوکے تھے کہ اگر کُتّے ہوتے تو کاٹ لیتے
میں نے اپنی دوست کی طرف دیکھا، وہ اپنا چہرہ دوسری طرف کئے
آنسو پونچھ رہی تھی....

ہم نے جیب چھوڑ دی
اور کیچڑ سے اپنے کپڑوں کو بچاتے چلنے لگے
سب طرف جُھگیاں تھیں اور عزّت کو خطرہ نہیں تھا
خطرہ تو انہیں ہوتا ہے جن کے پاس چار دیواری یا چادر ہو
یہاں دیواروں اور کپڑوں کی عیّاشی نہیں تھی
میں اپنی دوست سے بہت پیچھے رہ گیا
اور اچانک ایک چیخ، میرے دل سے آکر ٹکرائی
میں نے آگے بڑھ کر دیکھا
وہی لنگڑا بھکاری زمین پر سیدھا گرا پڑا تھا
اور میری دوست ڈرے ہوئے کبوتر کی طرح کانپ رہی تھی
میں نے دیکھا، اُس گندے ناپاک بھکاری کی آنکھوں میں
ایک بھوک اور تھی
لیکن افسوس کہ خوبصورت، امیر لڑکیاں فلائنگ ساسر
نہیں ہوتیں
اور گندے میلے بھکاریوں کے ساتھ نہیں جاسکتیں
ضرور کہیں کوئی تکنیکی غلطی ہوئی ہے
زمین کے جس ٹکڑے پر
مُٹھی بھر آٹے کا سوال، دِلوں پر دیوار کی صورت گرے
وہاں بھکاری کو فلائنگ ساسر کی بھیک نہیں دینی چاہیئے
تکنیکی غلطی نہیں کرنی چاہیئے ....
میری دوست کی آواز جیسے کنویں میں سے آرہی تھی، جیسے وہ
مجرم ہو، شرمسار ....
میں نے اسے دھکّا نہیں دیا، یہ مجھ پہ جھپٹا تھا اور اپنی لاٹھی سے
اُلجھ کر گر پڑا ....
پھر وہ رونے لگی
زمین پر انسان گرا پڑا تھا
میرے دل میں داس کیپٹیال کے ورق پھڑپھڑاتے رہے ....

(۲)

اسٹیج پر تُو پرچھائیں بنی
تو میری ہنسی میں کتنی کرچیاں تھیں
پرچھائیوں کی قطار میں
دوسری اداکارائیں بھی تھیں اور مسخرے ....
لیکن قہقہوں کے اندھے، کالے، بے حیا جنگل میں
تُو درد سے لہرائی
تو اس درد کو
میں نے دل میں سے نچوڑ کر
اور آنکھوں میں سے نچوڑ کر
اپنی جیب میں رکھ لیا
تو نے سامنے دیکھا، تماشائیوں میں، میری جانب
میری آنکھ کا شیشہ چٹخ گیا تھا
تیری پرچھائیں ڈول گئی
آگ کتنی مبارک ہے جو اتنی میلی آنکھوں کے درمیان بھی
تیرے دِل کو پاکیزہ رکھتی ہے
میں نے اس آگ کو چوُم لیا
میری آنکھیں اور تیرے ہونٹ کانپ رہے تھے .....

ہم اپنے لہو اور گوشت سے
کوڑے بناتے ہیں اور پھانسی کے رسّے
قید خانے بناتے ہیں اور سکّے
بازار بناتے ہیں اور اداکار
مجھے انہوں نے پھانسی دی اور تجھے اسٹیج
تیرے چہرے پر موت کا ڈر کانپا
میرے چہرے پر زندگی کا....

کوڑے ہم دونوں نے کھائے تھے
میں نے بدن پر، تو نے رُوح پر
ہم دونوں قیدی رہے
کبھی گھر کے اندر، کبھی بیرک میں
اور ہم بکتے بھی رہے
کبھی سونے کے بازار میں، کبھی شیشے کے بازار میں
ہم اپنے ہی لہو اور گوشت کے کٹے کی سزا پاتے ہیں
اور ALIENATE ہوتے ہیں
اپنے ہی لہو اور گوشت سے

پردہ گرتا ہے
ایک شریف عورت کی مقدس آنکھ تجھے گالی دیتی ہے
اور تجھ پر ہنستی ہے
ڈرامے کے بعد،
میں نے تجھے اداکاروں میں سے ڈھونڈھ نکالا
اور درد کو جیب میں سے
پھر آنکھوں میں
اور دل میں دوبارہ رکھ لیا
اور اب میری آنکھ کا چٹخا ہوا شیشہ بھی رو رہا تھا
تیری اداکاری پیچھے رہ گئی تھی
اسٹیج پر اور میک اپ رُوم میں
تُو نے کہا گالیوں کی پروا مت کرو
ہم محنت بیچتے ہیں
اور ہماری روتی آنکھ،
بازار نہیں، دلوں کی محرم ہے
بازار کی محرم، صرف ہنستی آنکھ ہوتی ہے
اور گالی دیتی آنکھ .... احمد سلیم

مارکس کے ساتھ ایک لنچ

مارکس کی علمی اور عملی زندگی اُس کی حیات کے دوران ہی یورپی حکمرانوں کے لئے انتہائی تشویش کا باعث بن گئی تھی جس کے نتیجے میں اسے پے در پے جلا وطنیوں اور انتہائی کٹھن اور شدید عسرت کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ سرمایہ دار طبقہ اپنے مفادات بلکہ اپنے وجود کے خلاف اُٹھنے والی اس توانا آواز سے لرزہ براندام تھا۔ جرمنی میں اس وقت کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی جس کی رہنمائی مارکس اور اینگلس کے ساتھی اور پیروکار کر رہے تھے' کی سرگرمی جرمن حکمران طبقوں کے لئے ایک سنجیدہ چیلنج بن چکی تھی جرمن بادشاہ بسمارک کی شادی ملکہ وکٹوریہ کی سب سے بڑی بیٹی سے ہوئی تھی۔ شہزادی موصوفہ نے برطانوی وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کے ایک وزیر ایم ای گرانٹ ڈف سے مارکس کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تو وزیر موصوف نے مارکس سے خصوصی ملاقات کے لئے ہاتھ پاؤں مارے اور اپنے تاثرات کا اظہار یکم فروری ۱۸۷۹ء کو شہزادی کے نام ایک خط میں کیا۔

ظاہر ہے کہ وزیر موصوف نے اس گفتگو کو اپنی مخصوص حاکمانہ عینک سے دیکھا مگر پھر بھی مندرجات سے مارکس کی فکر و فہم کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے مستقبل کے بارے میں مارکس کے خیالات کو جو مبہم جانا درحقیقت وہ بھی مارکس کے سائنسی اندازِ فکر کا آئینہ دار ہے اس لئے سماجی ارتقاء اور سماجی سائنس میں ایسے عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے جن کی عین مین پیش گوئی کرنا جادوگری یا مذہبی کرشمہ بازی تو ہو سکتی ہے مگر سائنس نہیں

البتہ زمان و مکان کی تخصیص ان اصولوں کے تخلیقی اطلاق کی متقاضی ہے جنہیں مارکس نے انتہائی صفائی اور تفصیلات میں دریافت کیا اور جن پر انسانی ارتقاء دن بدن صداقت کی مہر ثبت کر رہا ہے۔

یہ خط پہلی مرتبہ مارکس یادگاری لائبریری لندن کے سہ ماہی بلیٹن میں شائع ہوا۔ ذیل میں ہم اس کے اقتباسات کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

مترجم : شمعون سلیم

یکم فروری ۱۸۷۹ء

محترمہ

عزّت مآب جب مجھے پچھلی مرتبہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو آپ نے کارل مارکس کے بارے میں تجسّس کا اظہار کیا تھا اور استفسار فرمایا تھا کہ کیا میں اسے جانتا ہوں؟ آپ کی حسب خواہش میں نے مارکس سے شناسائی حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر کل سے پہلے مجھے اس سے ملاقات کا موقع میسّر نہیں تھا۔ میں اسے دوپہر کے کھانے پر ملا اور اس کے ساتھ تین گھنٹے گذارے۔

وہ چھوٹے قد کا بلکہ مختصر سا شخص ہے، سفید بالوں اور سفید داڑھی پر سیاہ مونچھیں عجب متضاد محسوس ہوتی ہیں۔ کسی حد تک گول چہرہ، اُبھری ہوئی اور تناسب پیشانی اور گہری نظریں۔ تاہم مجموعی تاثر بہرحال خوشگوار ہی پڑتا ہے۔ جھولوں سے بچّے اٹھا کر کھا جانے والے جیسا تو بہرحال ہرگز نہیں، جیسا کہ مجھے کہنے کی اجازت دیجئے، ہماری پولیس اس کا خاکہ کھینچتی ہے

اس کی گفت گو ایک پڑھے لکھے بلکہ عالم شخص کی گفت گو تھی جسے تقابلی گرامر سے دلچسپی ہو اور جس کے باعث اس نے بہت سا قدیم مشرقی یورپی اور غیر مروجہ مطالعہ کر رکھا ہو اور جس کی گفتگو میں شاطرانہ پیچ و خم اور خشک مزاج کی آمیزش ہو مثلاً جیسے وہ ہینز شل کی کتاب" شہزادہ بسمارک کی زندگی" کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا مقابلہ ڈاکٹر بش کی کتاب سے کرتا ہے اور اُسے" قدیم عہد نامہ" قرار دیتا ہے۔

اس کی گفتگو خوب" سوچی سمجھی ہوئی"، کسی حد تک قنوطی اور جوش و خروش کے اظہار سے عاری گفتگو تھی اور جیسا کہ میں نے محسوس کیا اکثر بہت درست خیالات پر مبنی تھی۔ خاص طور پر جب وہ ماضی اور حال کے بارے میں بات کر رہا ہوتا مگر جیسے ہی وہ مستقبل کا رُخ کرتا تو مبہم اور غیر تسلی بخش گفتگو کرنے لگتا۔

وہ انتہائی معقولیت کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ عنقریب روس میں ایک بڑی اور عظیم الشان تبدیلی رونما ہو گی جو کہ بالائی سطح پر اصلاحات سے شروع ہو گی جسے وہاں کی قدیم اور بہ خود غلط (معاشرتی) بنیاد برداشت نہ کر پائے گی اور یکسر زمین پر آ رہے گی۔ اس کی جگہ کیا رونما ہو گا بظاہر وہ اس کے بارے میں واضح خیالات نہیں رکھتا ماسوائے اس کے کہ ایک طویل عرصے تک رُوس یورپ پر اپنا اثر رسوخ مرتب کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائے گا۔ پھر اس کا خیال ہے کہ یہ تحریک جرمنی میں پھیل جائے گی جہاں یہ موجودہ عسکری نظام کے خلاف بغاوت کی شکل اختیار کرے گی۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ" لیکن آخر آپ یہ توقع کیسے کرتے ہیں کہ فوجی جوان اپنے کمانڈروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے؟ اُس نے جواب دیا کہ آپ یہ بھُول رہے ہیں کہ آج جرمنی میں فوج اور قوم تقریباً مماثل ہو گئی ہیں۔ یہ سوشلسٹ جن کے بارے میں آپ سُنتے ہیں دوسروں کی طرح تربیت یافتہ سپاہی ہیں۔

آپ کو صرف باقاعدہ فوج کے بارے میں ہی نہیں سوچنا چاہیئے آپ کو لازمی عسکری تربیت پانے والے شہریوں (LANDWEHR) کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ خود باقاعدہ فوج میں بھی بڑی بے چینی موجود ہے۔ آج تک کسی فوج میں ڈسپلن کے اس حد تک کڑا ہونے کے باعث اتنی خودکشیاں نہیں ہوئیں۔ خود کو گولی مارنے سے اپنے افسر کو گولی مارنے تک زیادہ دیر نہیں لگتی اور یہ پھر فوری طور پر قابل تقلید مثال بن جائے گی۔ مگر فرض کریں، میں نے کہا کہ یورپ کے حکمران اسلحہ سازی میں تخفیف پر باہمی سمجھوتہ کر لیں جس سے عوام کا بوجھ بہت زیادہ ہلکا ہو جائے گا۔ اس انقلاب کا کیا بنے گا جو آپ کے خیال میں یہ عوام ایک روز برپا کر دیں گے ؟"

آہ! اُس نے جواب دیا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ یہ سب باہمی رقابتیں مقابلے بازی اور سارے خوف ایسی کوشش کو ناکام بنا دیں گے۔ جیسے جیسے سائنس تباہی کے فن میں ترقی کرتی چلی جائے گی۔ یہ بوجھ اسی رفتار سے بڑھتا چلا جائے گا اور مہنگی جنگی مشینری کے لئے ہر سال زیادہ سے زیادہ پیسہ مختص کرنا پڑے گا یہ ایک پیچیدہ اور منحوس چکر ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے

"مگر جب تک حقیقی غربت نہ ہو تو آج تک کوئی سنجیدہ اور مقبول عام بغاوت نہیں ہوئی" اس نے کہا کہ آپ محسوس نہیں کر پائے ہے، پچھلے ۵ سالوں سے جرمنی میں چلنے والا بحران کتنا خوفناک ہے۔

خیر میں نے کہا، "فرض کریں کہ آپ کا انقلاب بپا ہو جائے اور آپ نے حکومت کا جمہوری نظام نافذ کر بھی دیا تو پھر بھی آپ اور آپ کے دوستوں کے مخصوص خیالات کو حقیقی شکل اختیار کرنے میں تو بہت عرصہ لگے گا" اس نے جواب دیا۔ "ہاں بے شک تمام عظیم تحریکیں آہستہ آہستہ منزل کی طرف بڑھتی ہیں۔ یہ بہتری کی جانب محض ایک قدم ہوگا جیسا کہ آپ کا ۱۸۶۶ء کا انقلاب تھا۔ طویل شاہراہ پر محض ایک قدم"

مندرجہ بالا سے عزت مآب شہزادی صاحبہ کو ان خیالات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا جو اس کے ذہن میں یورپ کے مستقبل قریب کے بارے میں ہیں۔ اس کے خوابوں جیسے خیالات خوفناک نہیں ہیں۔ ماسوائے اس کے کہ اسلحہ سازی پر دیوانہ وار اخراجات بدیہی طور پر بلاشک و شبہ ایک انتہائی خطرناک صورتحال کو جنم دے رہے ہیں۔

تاہم اگر آنے والے عشرے میں اس لعنت سے نبٹنے کے لئے کسی انقلاب کی کوشش کے خطرے کے بغیر، یورپ کے حکمران کوئی طریقہ نکال نہیں پاتے تو میں بذاتِ خود کم از کم اس براعظم پر انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہوں . . . .

پال لافراگ

مارکس ــ کچھ یادیں

میں پہلی مرتبہ مارکس سے فروری ۱۸۶۵ء میں ملا۔ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۴ء کو سینٹ مارٹن ہال لندن کے ایک جلسہ میں پہلی انٹرنیشنل کا قیام عمل میں آچکا تھا اور میں پیرس سے لندن اس غرض سے گیا تھا کہ اس نوزائیدہ تنظیم کے پیرس میں فروغ کے متعلق اطلاعات مارکس کو دے سکوں۔ ایم طولین نے، جواب بورژوا ری پبلک کے سینٹر ہیں، مجھے ایک تعارفی خط دیا تھا۔

اس وقت میری عمر ۲۴ سال تھی۔ جب تک میں زندہ ہوں، اس پہلی ملاقات کا اثر باقی رہے گا۔ اس وقت مارکس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ اس وقت وہ سرمایہ کی پہلی جلد پر کام کر رہے تھے۔ یہ جلد دو سال بعد ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ انہیں خدشہ تھا کہ بیماری کی وجہ سے وہ اپنا کام پورا نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے انہیں اس بات سے خوشی ہوتی تھی کہ نوجوان ان سے ملنے آتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "مجھے نوجوانوں کو تربیت دینا چاہئے تاکہ میرے بعد وہ کمیونسٹ پروپیگنڈے کا کام جاری رکھ سکیں۔"

کارل مارکس ان نادر شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ عوامی رہنما بھی تھے۔ زندگی کے یہ دونوں پہلو ان میں اس طرح مربوط ہو گئے تھے کہ ان کی زندگی کا جائزہ لیتے وقت عالم اور عوامی قائد (سوشلسٹ مجاہد)، دونوں ہی حیثیتوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔

مارکس کی یہ پختہ رائے تھی کہ سائنس کا مطالعہ سائنس کی حیثیت سے کرنا چاہئے، تحقیق کے نتیجہ سے لاتعلق ہو کر۔ لیکن سائنسداں اس وقت پوری طرح سے بھٹک جائے گا اگر وہ عوامی زندگی میں حصہ لینا بند کر دے۔ اسے اپنے آپ کو اپنے مطالعہ کے کمرے (اسٹڈی) یا لیبوریٹری میں بند نہیں کر

پال لافراگ (۱۸۴۲ء - ۱۹۱۱ء)۔ فرانسیسی اور بین الاقوامی مزدور طبقہ کی ایک ممتاز شخصیت، مارکس اور اینگلس کے دوست اور پیروکار۔ مارکس کی بیٹی لاورا کے شوہر۔

یہ "یادیں" پہلی مرتبہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھیں۔

لینا چاہیے۔ اسے کتاب کا کیڑا نہیں بن جانا چاہیے۔ اسے زندگی اور اپنے ہم عصروں کی سیاسی جدوجہد سے کنارہ کش نہیں رہنا چاہیے۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "سائینس کو خود غرضانہ مسرت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ جن لوگوں کو خوش قسمتی سے تحقیقی کام کرنے موقعہ ملا ہے، انہیں سب سے پہلے اپنی تحقیق اور علم کو انسانیت کے لئے وقف کر دینا چاہیے۔ ان کا مشہور مقولہ ہے: "انسانیت کے لئے کام کرو۔"

مارکس کو محنت کش طبقات سے زبردست ہمدردی تھی۔ مگر یہ ہمدردی جذباتی نہیں تھی بلکہ تاریخ اور سیاسی معاشیات کے مطالعہ کے ذریعہ وہ کمیونسٹ نظریات تک پہنچے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی بھی غیر جانبدار شخص جو نجی مفادات سے مبرا ہو گا اور طبقاتی مفادات نے اسے اندھا نہ کر دیا ہو تو ان ہی نتائج پر پہنچے گا۔

پہلے سے قائم شدہ نظریات اور آراء سے اوپر اٹھ کر مارکس نے انسانی معاشرہ کے معاشی اور سیاسی واقعات کا مطالعہ کیا مگر مارکس نے جو کچھ بھی لکھا اس کا واضح مقصد اپنی تحقیقات کا پرچار کرنا اور سوشلسٹ تحریک کو سائینسی بنیاد فراہم کرنا تھا۔ اس وقت تک یہ تحریک تصورات کے بادل میں گم تھی۔ انہوں نے مزدور طبقہ کی فتح کے لئے اپنے خیالات کا پرچار کیا جس کا تاریخی مشن، سماج کی سیاسی اور معاشی قیادت حاصل کرنے کے بعد جلد از جلد کمیونزم کی تعمیر ہے۔ ۔ ۔ ۔

مارکس نے اپنی سرگرمیوں کو اپنے پیدائش کے ملک تک محدود نہیں کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں تو دنیا کا شہری ہوں۔ میں جہاں رہوں گا سرگرم رہوں گا۔" بات سچ بھی ہے حالات اور سیاسی استبداد کی وجہ سے انہیں جس ملک میں۔ انگلینڈ، فرانس، بلجیم میں رہنا پڑا، انہوں نے وہاں کی انقلابی تحریکوں میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔

مگر جب ان سے پہلی مرتبہ ان کی میت لینڈ روڈ کی اسٹڈی میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو میرے سامنے انتھک اور عدیم المثال سوشلسٹ مجاہد مارکس، نہیں بلکہ عالم اور محقق مارکس تھے۔ یہ اسٹڈی وہ مرکز تھی جہاں مہذب دنیا کے تمام حصوں سے پارٹی کامریڈز سوشلسٹ نظریات کے اس عظیم محقق اتالیق کی رائے جاننے کے لئے آیا کرتے تھے۔ محقق مارکس کی زندگی سے واقف ہونے سے پہلے ان کی اسٹڈی کی ترتیب اور ہئیت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

یہ اسٹڈی پہلی منزل پر تھی۔ اس میں پارک کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی جس سے کافی روشنی کمرے میں آتی تھی۔ کھڑکی کے سامنے آتشدان کے دونوں کے دونوں طرف کتابوں کے شیلف تھے جو کتابوں سے اٹے ہوئے تھے۔ اخبارات کے تراشوں اور قلمی نسخوں کا انبار چھت تک پہنچتا تھا۔ روشندان

کے سامنے کھڑکی کے دونوں طرف دو میزیں تھیں جو اخبارات اور کتابوں سے لدی ہوئی تھیں ۔ کمرے کے وسط میں، جہاں زیادہ روشنی تھی، ایک سیدھا ڈیسک (رقبہ ۲ × ۳ فٹ) اور ایک لکڑی کی آرام کرسی تھی۔ آرام کرسی اور کتابوں کی شیلف کے درمیان، کھڑکی کے سامنے، ایک چمڑے کا صوفہ پڑا تھا جس پر وقفہ وقفہ سے آرام کرنے کے لئے مارکس لیٹ جایا کرتے تھے۔ مینٹل پیس پر بھی بہت سی کتابیں تھیں۔ اس کے علاوہ یہاں ہی سگار، ماچس، تمباکو ڈبہ، پیپر ویٹ، مارکس کی بیٹیوں اور بیوی اور ولیہم وولف[1] اور فریڈرک اینگلس کی تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔

مارکس بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ "میں نے سرمایہ لکھتے وقت جتنے پیسوں کی سگریٹ پی ہے، اتنا پیسہ مجھے اس کی اشاعت سے نہیں ملے گا" مگر سگریٹ سے زیادہ وہ ماچس خرچ کیا کرتے تھے۔ وہ سگار یا پائپ کو جلا کر ایسا محو ہو جاتے تھے کہ کبھی کبھی تو اس سگار یا پائپ کو بار بار جلانے کے لئے مختصر سی مدت میں وہ ماچس کی کئی ڈبیاں خالی کر دیتے تھے۔

انہوں نے کبھی بھی کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ ان کی کتابوں یا کاغذات کو ترتیب سے — زیادہ صحیح لفظوں میں بے ترتیبی سے — رکھے۔ بظاہر جو چیزیں بے ترتیب نظر آتی تھیں، دراصل مارکس کے نقطۂ نظر سے وہ ترتیب میں تھیں اور انہوں نے چیزوں کو اس ڈھنگ سے رکھا تھا کہ جب وہ جو چیز چاہتے، چاہے کتاب ہو یا نوٹ بک اسے باآسانی ڈھونڈ لیتے۔ اکثر بات چیت کے دوران بھی وہ کتابوں سے وہ اقتباسات یا اعداد و شمار نکال کر دکھاتے تھے جس کا انہوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے حوالہ دیا ہو۔ سچائی تو یہ ہے کہ مارکس اور ان کی اسٹڈی ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ اس میں رکھی ہوئی کتابیں اور کاغذات مارکس کے اتنے ہی قابو میں تھیں جتنا ان کے ہاتھ پیر ان کے قابو میں تھے۔

مارکس اپنی کتابوں کو جماتے وقت ان کی ضخامت اور سائز کو دھیان میں نہیں رکھتے تھے۔ مختلف سائز اور ضخامت کی کتابیں اور پمفلٹ ایک دوسرے کے پاس پاس رکھے ہوئے تھے وہ کتابوں کو ان کے سائز نہیں بلکہ ان کے موادکے حساب سے رکھتے تھے۔ کتابیں نمائش کے لئے نہیں بلکہ کام کے لئے تھیں۔ انہیں کتاب کے ضخامت، سائز، کاغذ وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی جلد کیسی ہے، اس سے بھی انہیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ اکثر صفحات کے کونے موڑ دیتے، حاشیہ میں پنسل سے نشان لگاتے اور پورے پورے جملوں کے نیچے خط کھینچ دیتے ۔

---

[1] ولیہم وولف (۱۸۰۹ - ۱۸۶۴ء) جرمن پرولتاری انقلابی جو مارکس اور اینگلس کے دوست اور ساتھی تھے۔ مارکس نے سرمایہ کو ان ہی سے منسوب کیا ہے۔

کبھی کتاب پر لکھتے نہیں تھے۔ اگر کبھی مصنف حد سے ہی بڑھ گیا ہو تو وہ پھر سوالیہ نشان لگانے کی حد ضرور پار کر جاتے۔ جملوں کو خط کشیدہ کرنے کے ان کے طریقہ سے انہیں ضرورت پڑنے پر حوالہ کے لئے کسی بھی کتاب سے متعلقہ حصّہ تلاش کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ انہیں کئی برسوں بعد اپنی نوٹ بک کو دیکھنے اور اس کی مدد سے خط کشیدہ حصّوں کو پڑھنے کی عادت تھی۔ وہ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ ان حصّوں کے تعلق سے ان کی یادداشت تازہ رہے۔ ان کی یادداشت غضب کی تھی۔ یہ عادت انہوں نے ہیگل کی اس ہدایت کے مطابق ڈالی تھی کہ کسی ایسی زبان کے اشعار حفظ کرو جو تمہیں نہیں آتی۔ ایسا کرنے سے یادداشت تیز ہوتی ہے۔

انہیں ہینے اور گوئٹے کا کلام حفظ تھا اور اکثر بات چیت میں ان کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے تمام یورپی زبان کے شاعروں کے کلام انتہائی دلچسپی سے پڑھا تھا۔ وہ ہر سال آئشلیئس[1] کا یونانی زبان میں ہی مطالعہ کرتے تھے۔ وہ اسے اور شکسپیر کو انسانی تاریخ کا سب سے عظیم ڈرامہ نویس مانتے تھے۔ وہ شکسپیر کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ انہوں نے شکسپیر کی تمام تصانیف کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کے معمولی سے معمولی کردار کے بارے میں بھی جانتے تھے۔ سچائی تو یہ ہے کہ ان کے پورے خاندان کو اس عظیم ڈرامہ نویس سے عقیدت تھی۔ ان کی تینوں بیٹیوں کو تو اس کی کئی تخلیقات ازبر تھیں۔ ۱۸۴۸ء میں وہ انگریزی پڑھنا جانتے تھے مگر جب انہوں نے اس میں مہارت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے شکسپیر کی تخلیقات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے اندازِ بیان کی تمام خوبیوں کو اپنایا۔ یہی صورت حال ولیم کوبٹ[2] کی تصانیف کے ساتھ تھی۔ کوبٹ کا بھی وہ بہت احترام کرتے تھے۔ دانتے اور رابرٹ برنس ان کے پسندیدہ شاعروں میں شامل تھے۔ جب انکی بیٹیاں اسکاٹس شاعر کی کوئی نظم یا طربیہ گاتیں تو وہ بڑی دلچسپی سے سنتے۔

عظیم محقق کوئیر نے پیرس میوزیم میں، جس کے وہ ڈائرکٹر تھے، میوزیم میں کمروں کا ایک سلسلہ، اپنے ذاتی استعمال کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ ہر کمرہ علم کی ایک علیحدہ شاخ کے لئے مخصوص تھا جو اس علم کی تمام کتابوں، اوزار اور دوسرے ضروری ساز و سامان سے پوری طرح لیس تھا۔ جب وہ ایک کام سے اکتا جاتے تو دوسرے کمرے میں جا کر دوسرے علم کے تحقیقی کام میں مشغول ہو جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ تحقیقی کام کے موضوع میں یہ تبدیلی، ان کے لئے آرام کا سبب ہوتی تھی۔

۱۔ آئشلیئس (۴۵۶ - ۵۲۵ ق۔م) ممتاز یونانی ڈرامہ نویس۔ کلاسیکی المیوں کے مصنف۔
۲۔ ولیم کوبٹ (۱۸۳۵-۱۷۶۲ء)۔ انگریزی سیاستداں اور پرچارک جنھوں نے برطانیہ کے سیاسی نظام کو جمہوری بنانے کے لئے جدوجہد کی۔

کوبر ہی کی طرح مارکس بھی ایک انتھک محقق تھے مگر انہیں کوبر کی طرح کئی کمروں کی سہولیت حاصل نہیں تھی۔ وہ اپنی اسٹڈی میں ہی چہل قدمی کر کے آرام کر لیا کرتے تھے۔ دروازے سے کھڑکی تک چہل قدمی سے ایسی واضح روش بن گئی تھی، جیسی چمن میں نظر آتی ہے۔

وقفہ وقفہ سے وہ صوفے پر دراز ہو جاتے اور ناول پڑھنا شروع کر دیتے۔ اکثر ایک ساتھ دو یا تین ناول شروع کر دیتے اور ان کے مختلف ابواب بیچ بیچ میں پڑھتے جاتے۔ ڈارون کی طرح سے انہیں بھی ناول پڑھنا بہت پسند تھا۔ وہ عام طور سے ۱۸ ویں صدی کے بالخصوص فیلڈنگ کی "ٹام جونس" کو بہت پسند کرتے تھے۔ عصر حاضر کے ناول نگاروں میں پال ڈی کوک، چارلس لیور، الیگزینڈر دوماس سینئر اور والٹر اسکاٹ کو پسند کرتے تھے۔ والٹر اسکاٹ کی اولڈ مارٹالٹی کو فن پارہ کا درجہ دیتے تھے۔ انہیں تحیر آمیز اور طربیہ کہانیاں زیادہ پسند تھیں۔

وہ سروانتس اور بلازک کو دوسرے تمام ناول نگاروں سے برتر مانتے تھے۔ ڈان کاکسوٹ میں انہوں نے جاں بلب جاگیرداری کا رزمیہ دیکھا جس کی اچھائیوں کا ابھرتی ہوئی سرمایہ دار دنیا میں مذاق اڑایا جاتا اور ان کا گلا گھونٹا جا رہا تھا۔ وہ بلازک کو اس حد تک پسند کرتے تھے کہ معاشیات پر اپنا تخلیقی کام مکمل کر کے اس کی عظیم تخلیق لا کامیڈی ہیومینے پر تبصرہ لکھنا چاہتے تھے۔ وہ بلازک ایسے کرداروں کی تخلیق کی پیغمبرانہ صلاحیتوں کا حامل ہے جو لائیس فلپ کے دور میں ابھی شکم مادر میں تھے اور جن کا جنم ان کی موت کے بعد نپولین سوم کے دور میں ہوا۔

مارکس تمام یورپی زبانیں پڑھ سکتے تھے۔ وہ تین یورپی زبانوں جرمن، فرانسیسی اور انگریزی میں لکھ سکتے تھے۔ وہ ایسی شاندار زبان لکھتے تھے کہ ان زبانوں کے ماہرین بھی ستائش کرتے تھے۔ وہ اکثر یہ قول دہراتے تھے کہ "زندگی کی جدوجہد میں بدیسی زبان ہتھیار کا کام دیتی ہے۔"

زبان سیکھنے کے معاملے میں انکی صلاحتیں غیر معمولی تھیں۔ یہی صلاحیت ان کی بیٹیوں کو بھی ورثہ میں ملیں۔ انہوں نے روسی زبان اس وقت سیکھنی شروع کی جب وہ پچاس برس کے ہو گئے تھے۔ وہ جو جدید اور کلاسیکی زبانیں جانتے تھے، ان میں سے کسی کا بھی روسی زبان سے کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی چھ مہینوں میں انہوں نے اس میں مہارت حاصل کر لی کہ وہ روسی نظم و نثر سے لطف اٹھانے لگے تھے۔ پوشکن، گوگول اور شیشدرین ان کے پسندیدہ مصنفین تھے۔ انہوں نے روسی زبان اس لئے سیکھی تھی کہ سرکاری تحقیقات کی ان دستاویزات کا مطالعہ کر سکیں جنھیں روسی سرکار نے اس وجہ سے دبا دیا تھا کہ ان میں بہت سے سیاسی انکشافات کئے گئے تھے۔ مارکس کے مخلص دوستوں نے یہ دستاویزات ان کے لئے فراہم کی تھیں، مغربی یورپ میں وہ واحد ماہر معاشیات ہیں جس نے ان دستاویزات کا مطالعہ کیا۔

شاعری اور ناولوں سے حظ اٹھانے کے علاوہ، دانشوارانہ آرام کی ایک اور پسندیدہ شکل حساب تھی۔ الجبرا سے تو انہیں روحانی سکون بھی ملتا تھا اور جب وہ بہت زیادہ پریشان ہوتے تو اس میں ہی پناہ لیتے۔ اپنی بیوی کی آخری بیماری سے جو ذہنی تکلیف ہوئی تھی، اس سے نجات کے لئے ان کا واحد سہارا حساب کا شغل تھا۔ اس ذہنی پریشانی کے دور میں انہوں نے علم الحساب کے ایک پیچیدہ مسئلہ پر ایک ایسا مضمون لکھا جو ماہرین کی رائے میں تحقیقاتی نقطہ نظر سے انتہائی اہم ہے اور اسے ان کے مجموعہ مضامین میں شامل کیا جائے گا۔ اعلیٰ علم الحساب کو وہ سب سے زیادہ منطقی مانتے تھے۔ ان کی یہ بھی رائے تھی کہ یہ جدلیاتی حرکت کی آسان ترین شکل ہے۔ ان کی رائے میں کوئی بھی علم اس وقت تک پوری طرح فروغ نہیں پاسکتا جب تک وہ علم الحساب کے استعمال سے پوری واقف نہ ہو۔

اپنی زندگی بھر کے تحقیقاتی کام کے دوران مارکس نے اپنی لائبریری کے لئے ایک ہزار سے زائد کتابیں جمع کرلی تھیں مگر یہ ان کے لئے کافی نہیں تھیں۔ اس لئے وہ برسوں تک باقاعدگی سے برٹش میوزیم کی لائبریری جاتے رہے۔ وہ اس لائبریری کی فہرست کتب کی زبردست ستائش کرتے تھے۔

مارکس کے مخالفین بھی اس بات کے معترف تھے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ نہ صرف اپنے مخصوص مضمون۔ سیاسی معاشیات۔ سے بلکہ تاریخ، فلسفہ اور تمام ملکوں کے ادب کے متعلق بھی بہت اچھی معلومات رکھتے تھے۔

حالانکہ مارکس رات میں دیر سے سوتے تھے، اس کے باوجود وہ ہمیشہ صبح آٹھ سے نو بجے کے درمیان بیدار ہو جاتے۔ کالی کافی پیتے، اخبارات کا مطالعہ کرتے اور پھر اسی دارالمطالعہ میں چلے جاتے جہاں وہ پچھلی رات دو تین بجے تک کام کرتے رہے تھے۔ وہ صرف کھانا کھانے کے لئے اپنے کام سے ہٹتے یا اس وقت جب موسم شام میں ہمپسٹیڈ ہینھ پر چہل قدمی کی اجازت دیتا۔ کبھی کبھی دن میں وہ صوفے پر ہی ایک دو گھنٹے کے لئے سو جاتے۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں تو وہ اکثر رات بھر کام کرتے تھے۔

مارکس کو اپنے کام کی لگن تھی۔ اکثر وہ اپنے کام میں اس قدر محو ہوتے کہ کھانا کھانا بھی بھول جاتے۔ اکثر انہیں کھانے کے لئے کئی کئی مرتبہ بلانا پڑتا تھا۔ وہ ڈائننگ روم میں آتے اور ابھی آخری نوالہ پوری طرح سے ختم بھی نہیں ہوتا کہ پھر اسٹیڈی میں پہنچ جاتے۔

وہ بہت کم خوراک آدمی تھے۔ اکثر انہیں بھوک نہ لگنے کی شکایت رہتی۔ وہ انتہائی چٹ پٹی چیزوں۔ ہیم، بھونی مچھلی، مچھلی کے انڈے اور اچار وغیرہ کے ذریعہ اس پر قابو پانے کی کوشش

کرتے۔ ان کے زبردست ذہنی کام کا بھگتان ان کے پیٹ کو بھگتنا پڑتا۔ انہوں نے اپنے دماغ کے لئے اپنے پورے جسم کو قربان کر دیا۔ سوچنا، ان کی سب سے پسندیدہ تفریح تھی۔ میں نے اکثر انہیں اپنے دور کے عظیم فلسفی ہیگل کے اس قبول کو دہراتے ہوئے سنا ہے کہ "سوچ، خواہ وہ جرم ہی کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو، جنت کی تحیرانگیز چیزوں سے زیادہ عظیم اور اعلیٰ ہے۔"

اس غیر معمولی زندگی اور تھکا دینے والے ذہنی کام کے لئے ان کی جسمانی ساخت اچھی ہونی چاہئے تھی۔ وہ مضبوط کاٹھی کے آدمی تھے۔ ان کا قد، عام آدمیوں کے قد سے ذرا سا نکلتا ہوا، کشادہ کاندھے، وسیع سینہ اور انتہائی متناسب اعضا رکے حامل مارکس کی ریڑھ کی ہڈی، پیروں کے مقابلہ میں قدرے زیادہ لمبی تھی۔ ایسا ہونا یہودیوں کے یہاں عام بات ہے۔ اگر اپنی جوانی کے دنوں میں انہوں نے ورزش کی ہوتی تو اچھے خاصے پہلوان ہوتے۔ انہوں نے باقاعدگی سے جو ورزش کی وہ چہل قدمی ہے۔ وہ گھنٹوں چہل قدمی کر سکتے تھے یا باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے ہوئے اوپر چڑھ سکتے تھے، اس کے باوجود وہ تھکن نہیں محسوس کرتے۔ سچائی تو یہ ہے کہ وہ اپنے کمرے میں چہل قدمی کرتے ہوئے ہی کام کرتے تھے اور کرسی ٹیبل پر تو صرف اسی وقت بیٹھتے جب انہیں سوچی ہوئی بات نوٹ کرنی ہوتی۔ وہ چہل قدمی کرتے کرتے ہی بات کرنا پسند کرتے تھے۔ وہ رکتے اس وقت جب بحث زیادہ گرم ہو جاتی یا گفتگو سنجیدہ رخ اختیار کر لیتی۔

کئی سالوں تک میں شام میں ہمپسٹیڈ ہیتھ پر ان کے ساتھ چہل قدمی کے لئے جاتا رہا۔ اسی چہل قدمی کے دوران میں نے معاشیات میں ان سے درس لیا۔ چہل قدمی کے اسی وقفہ کے دوران بغیر کسی نوٹ کی مدد کے انہوں نے مجھے سرمایہ کی پہلی جلد کا مواد، اسی ترتیب میں سمجھایا، جیسا کہ بعد میں انہوں نے لکھا۔

چہل قدمی سے لوٹنے کے بعد، میں نے سنی ہوئی باتوں کا ممکنہ حد تک تفصیلی نوٹ لینا، اپنی عادت بنا لیا تھا۔ ابتدا میں میرے لئے مارکس کی زبردست پیچیدہ دلیلوں کو سمجھنا میرے لئے خاصا مشکل تھا۔ بدبختی سے میرے یہ قیمتی نوٹ تباہ ہو گئے۔ پیرس کمیون کے بعد، پولیس نے پیرس اور بارڈوکس میں میرے سامان کو تباہ و برباد کر دیا اور میرے تمام کاغذات جلا دیئے۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اس نوٹ کا ہے جو ایک شام مارکس کے اس لکچر پر مبنی تھا جب انہوں نے اپنی عادت کے مطابق، انتہائی مدلل اور قائل کن انداز میں مجھے انسانی معاشرہ کے فروغ کے متعلق تھیوری پر دیا تھا۔ اس لکچر کو سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ پہلی مرتبہ میں عالمی تاریخ کی منطق اتنے واضح انداز میں سمجھ سکا اور میرے لئے ممکن ہوا کہ میں معاشرہ اور نظریات کے فروغ کے دو بظاہر متضاد عوامل کی مادی بنیادی کو سمجھ سکوں۔ میں محو حیرت رہ گیا اور یہ تاثر برسوں قائم رہا۔

یہی حالت میڈرڈ کے سوشلسٹوں کی بھی ہوئی، جب میں نے اپنی کم مائیگی کے باوجود انہیں مارکس کی ان عظیم تھیوریوں کے متعلق بتایا جو بلاشبہ آج تک، انسانی ذہن کی عظیم ترین تخلیقات ہیں۔

مارکس کے ذہن میں تاریخ، سائنس اور فلسفیانہ نظریات کے متعلق حقائق کا ناقابلِ یقین حد تک وسیع ذخیرہ تھا — انہیں تحقیقاتی کام کے دوران حاصل کئے گئے علم اور حقائق کو استعمال کرنے میں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ آپ کسی بھی وقت، کسی بھی موضوع پر ان سے کوئی بھی بات پوچھیں، آپ جتنی تفصیل کی امید رکھتے ہوں گے، اس سے زیادہ ہی تفصیل کے ساتھ مارکس اس کا جواب دیتے اور پھر وہ عمومی نوعیت کے فلسفیانہ مظاہر کی بھی نشاندہی کر دیتے۔ ان کا دماغ، میدان جنگ کا حربی دستہ تھا، جسے جس وقت بھی چاہیں، جس سمت میں داغا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سرمایہ علم و جانکاری کا بیش و بہا خزانہ ہے۔ مگر میرے لئے اور ان تمام لوگوں کے لئے جو مارکس کو قریب سے جانتے تھے، سرمایہ یا ان کی کوئی بھی دوسری تخلیق اس علم اور ذہانت کا احاطہ نہیں کرتی جس کے مارکس حامل تھے۔ وہ علم اور ذہانت کے معاملے میں اپنی تمام تخلیقات سے بہت زیادہ بلند تھے۔

میں نے مارکس کے ساتھ کام کیا ہے، میں ان کا مسودہ نویس تھا۔ وہ بولتے جاتے اور میں لکھتا۔ اس سے مجھے ان کے سوچنے اور لکھنے کے انداز کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔ کام ان کے لئے بہت آسان تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ دشوار بھی۔ آسان اس لئے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے، اس کے متعلقہ حقائق اور اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ اس علم یا موضوع کے ماہر ہوتے۔ مگر مہارت اور علم کی زیادتی، ان کی تحریروں میں دشواری بھی پیدا کرتی۔ اس کی وجہ سے اپنے نظریات کی وضاحت کے لئے انہیں بہت زیادہ لکھنا پڑتا۔

وہ صرف سطح کو نہیں دیکھتے، بلکہ اس کے نیچے کیا ہے اس کا بھی مطالعہ کرتے۔ وہ کسی بھی چیز کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے، ان کے باہمی عمل اور ردِ عمل کا جائزہ لیتے، پھر ان سب کو الگ الگ کر کے دیکھتے اور ان کے فروغ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے۔ پھر اس چیز کے اطراف کا جائزہ لیتے اور متعلقہ چیز پر ماحول کے اثرات اور ماحول پر اس کے اثرات کا مطالعہ کرتے۔ وہ کسی بھی موضوع پر نقطۂ آغاز سے شروع کرتے پھر وہ ارتقاء اور انقلاب کی جن جن منزلوں سے گذرا ہے اس کا جائزہ

نمبر۲ پیرس کمیون کی شکست کے بعد، مارکس اور پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کی ہدایت پر لافارگ اسپین چلے گئے تھے۔ انہیں باکونن کے ماننے والوں کے انارکی نظریات کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔

لیتے اور اس کے دور دراز تک اثرات کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے۔ وہ کسی چیز کو الگ کر کے، محض اس کے مطالعہ کے نقطۂ نظر سے، ماحول سے الگ، اس چیز کا مطالعہ نہیں کرتے۔ وہ اسے مسلسل حرکت میں رہنے والی اس پیچیدہ دنیا کے ایک مظہر کے طور پر ہی دیکھتے۔

ان کا ارادہ تھا کہ وہ پوری دنیا کے بارے میں، اس کے تمام مظاہر اور ہیئتوں کے بارے میں لگاتار ہونے والے مختلف عمل اور ردِّ عمل کے ساتھ مطالعہ کریں۔ فلابرٹ اور گن کورٹ کے مکتبِ خیال کے ادیب شکایت کرتے ہیں کہ انسان جو کچھ دیکھتا ہے، اسے ویسا ہی ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا (آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آ سکتا نہیں۔ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی) اس کے باوجود جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ سطح کے بارے میں ہے، یہ وہ "ترتیب" جو سطح کو دیکھنے سے ان پر ظاہر ہوا۔ مارکس کی تخلیقات کے مقابلے میں ان کی ادبی تخلیقات بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ حقائق کو جاننا اور جو کچھ دیکھا اور سمجھا، اسے ویسا ہی دوسروں تک پہنچانا اور انہیں سمجھانا، بڑا مشکل کام ہے۔ اس کے لئے غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہے۔ مارکس کبھی بھی اپنی کسی تخلیق سے مطمئن نہیں رہتے۔ وہ ہمیشہ اس میں سدھار کرتے رہتے۔ وہ اپنی تحریر کو اپنے اس نظریہ کے مقابلہ میں جسے وہ پیش کرنا چاہتے ہوں، ہمیشہ کمتر پاتے۔

مارکس کی ذہانت پر کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ ان کی دو خصوصیات خاص طور سے اہم ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع یا چیز کو اس کے اجزائے ترکیبی میں تقسیم کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کے حامل تھے۔ اسی طرح انہیں اس تقسیم شدہ موضوع یا چیز کو اس کے فروغ کی تمام ہیئتوں اور اشکال میں، ان کے باہمی داخلی عوامل کے ساتھ پھر سے یکجا کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے نتائج تصوراتی نہیں تھے جیسا کہ ان کے زمانے کے ان ماہرینِ معاشیات کا شیوہ تھا جو فکر و خیال کی قوت سے محروم تھے۔ وہ جیومیٹری کے ان ماہرین کی طرح بھی نہیں تھے جو مثال تو دنیا سے لیں گے مگر نتائج اخذ کرتے وقت حقائق کو یکسر فراموش کر دیں گے۔ "سرمایہ" کوئی تصوراتی، یا حقائق سے الگ تھلگ وضاحتوں اور فارمولوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس میں سلسلہ وار دہ تحقیقاتی تجزیات دیئے گئے ہیں جو انتہائی تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان کی بہت ہی دو ٹوک اور واضح تشریح بھی کرتے ہیں۔

مارکس اپنی تھیوری کا آغاز اس واضح حقیقت کو بیان کرنے سے کرتے ہیں کہ جس معاشرہ پر سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کو غلبہ حاصل ہو۔ وہاں دولت اجناس کے انتہائی وسیع پیمانے پر ارتکاز کا ہی مظہر ہے۔ اس طرح جنس، جو ایک ٹھوس موضوع ہے، علم الحساب کا کوئی تصوراتی مظہر نہیں۔ سرمایہ دارانہ دولت کا بنیادی عنصر یا ابتدائی خلیہ ہے۔ اس کے بعد مارکس جنس کا ہر پہلو سے جائزہ لیتے ہیں پھر یکے بعد دیگرے ان رازوں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں جن سے سرکاری ماہرینِ معاشیات

واقف نہیں تھے۔ حالانکہ یہ راز، عیسائیت کی محیر العقل داستانوں سے زیادہ واضح اور بیّن ہیں۔ جنھیں ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد مارکس، تبادلہ کی حالت میں دوسری اجناس سے اس کے تعلق کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس کی پیداوار اور پیداواری عمل کی تاریخی ماہیت کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ وہ جنس کی مختلف اشکال کو ظاہر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح جنس کی ایک شکل، دوسرے کی پیداوار ہے۔ وہ اس کی منطقی راہ کو اس واضح انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ان کے تصور میں ہو رہا ہو۔ مگر یہ سب حقیقت کی پیداوار ہے۔ جنس کی حقیقی جدلیات کی مکرر پیداوار ہے۔

مارکس حقائق اور اعداد و شمار کے متعلق بہت زیادہ محتاط تھے۔ انہوں نے کبھی بھی کوئی ایسے حقائق اور اعداد و شمار نہیں پیش کئے جنکی بہترین ذرائع نے تصدیق نہ کی ہو۔ وہ بالواسطہ ملی معلومات سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ متعلقہ علم کے منبع سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے، خواہ ایسا کرنا کتنا ہی مشکل اور دشوار کیوں نہ ہو۔ معمولی سی بات کی تصدیق کے لئے بھی وہ برٹش میوزیم جا کر متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ ان کے مخالفین کبھی بھی، ان کی اس بات پر نکتہ چینی نہیں کر سکے کہ انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو جس کی تصدیق نہ کی جا سکے یا وہ کسی ایسے موضوع پر لکھ گئے ہوں جس کے بارے میں انہیں جانکاری نہیں تھی۔

اصل سے حوالہ دینے کی ان کی عادت نے انہیں بہت سے ایسے مصنفین کی کتابوں کو پڑھنے پر مجبور کر دیا جو بہت کم مشہور تھے اور جن کا حوالہ دینے والے وہ واحد شخص تھے ——— سرمایہ میں چھوٹے موٹے مصنفین کی کتابوں سے اتنے زیادہ حوالے موجود ہیں کہ یہ تاثر بھی قائم ہو سکتا ہے کہ اس طرح شاید مارکس یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ مگر ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں تاریخی انصاف کا قائل ہوں، ہر کسی کو اس کا جائز مقام دینا چاہتا ہوں۔" وہ اپنے آپ کو اس بات کا پابند سمجھتے تھے کہ اگر کسی نے سب سے پہلے کوئی خیال پیش کیا ہو اسے ممکنہ حد تک صحیح شکل میں سب سے پہلے پیش کیا ہو تو اس نظریہ کا تذکرہ کرتے وقت اس کا ہی حوالہ دینا چاہیے خواہ مصنف کتنا ہی گم نام کیوں نہ ہو۔

محض حقائق کی حد تک مارکس، اس اصول کے پابند نہیں تھے۔ بلکہ مواد کی پیش کش کے سلسلے میں بھی ایسی ہی پابندی کے قائل تھے۔ انہوں نے کبھی بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی جس کے متعلق انہوں نے تفصیل سے نہ پڑھا ہو۔ اسی طرح سے اپنی تحریر کے متعلق بھی وہ یہی اصول اپناتے۔ انکی کوئی بھی تخلیق اس وقت تک شائع نہیں ہوئی، جب تک انہوں نے اسی کو کئی مرتبہ پڑھا اور سدھارا نہ ہو۔ وہ کسی بھی تخلیق یا مضمون کو اسی وقت اشاعت کے لئے بھیجتے، جب اس کے فارم اور انداز تحریر سے وہ مطمئن ہوں۔ وہ عوام کے سامنے یہ تاثر نہیں دینا چاہتے کہ وہ اس موضوع پر پوری طرح

حاوی نہیں ہیں۔ وہ آخری شکل دینے سے پہلے مسودہ کسی کو دکھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ ان کے لئے سب سے بڑی اذیت تھی۔ وہ اس معاملے میں اس قدر سخت تھے کہ ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا کہ نامکمل مسودہ دکھانے سے زیادہ میں اسے جلا دینا پسند کروں گا۔

ان کا طریقۂ کار کبھی کبھی ان پر اتنا زیادہ بوجھ ڈال دیتا کہ قارئین اندازہ نہیں لگا سکتے۔ سرمایہ میں انہیں برطانیہ کے فیکٹری قوانین کے متعلق بیس صفحات لکھنے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے بلیو بکس کی ایک پوری لائبریری کا مطالعہ کر ڈالا جس میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے فیکٹریوں کے کمیشنوں اور فیکٹری انسپکٹروں کی رپورٹیں تھیں۔ انہوں نے اول تا آخر ان کا مطالعہ کیا جس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان پر جگہ جگہ پنسل کے وہ نشانات ہیں جو انہوں نے دوران مطالعہ لگائے تھے۔ وہ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے مطالعہ کے لئے ان رپورٹوں کو سب سے زیادہ اہم اور باوزن دستاویزات سمجھتے تھے۔ ان رپورٹوں کو لکھنے والے انسپکٹروں کے متعلق ان کی رائے اتنی بلند تھی کہ انہوں نے لکھا ہے کہ "انگریزی فیکٹری انسپکٹروں سے زیادہ لائق، غیر جانبدار اور رفرد کا احترام کرنے والے "فیکٹری انسپکٹر یورپ کے کسی دوسرے ملک میں ملنا مشکل ہیں۔ انہوں نے ان فیکٹری انسپکٹروں کو سرمایہ کے پیش لفظ میں شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ان رپورٹوں اور کتابوں سے مارکس نے زبردست معلومات حاصل کیں اور ان کا پورا پورا استفادہ کیا۔ جن ممبران پارلیمنٹ کے لئے یہ نیلی کتابیں تیار کیں جاتی تھیں وہ اس کا بہت ہی عجیب و غریب استعمال کرتے تھے۔ زیادہ تر تو اسے لانگ ریکر کے ردی بازار میں بیچ دیتے تھے۔ یہ ٹھیک بھی تھا، ورنہ مارکس کو انہیں سستے داموں پر خریدنے کا موقع کیسے ملتا۔ مارکس اکثر اس ردی بازار میں جاکر پرانی کتابیں اور کاغذات خریدا کرتے تھے۔ پروفیسر بیلے نے کہا ہے کہ مارکس ہی وہ آدمی ہے جس نے برطانیہ کی سرکاری تحقیقات کا سب سے زیادہ استعمال کیا اور دنیا کو ان سے باخبر کیا۔ ۱۸۴۵ء سے پہلے وہ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ اینگلز نے برطانیہ کے مزدور طبقہ کی حالت پر اپنی کتاب لکھتے وقت ان نیلی کتابوں سے ملاتعداد دستاویزات کو استعمال کیا ہے۔

(۲)

عالم اور محقق مارکس کے سینے میں دھڑکنے والے دل کی عظمت کو سمجھنے کے لئے ہمیں انہیں اس وقت دیکھنا ہوگا جب وہ اپنی کتاب اور نوٹ بک بند کرکے اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ ہوں یا پھر اتوار کی شام دوستوں کی محفل میں۔ وہاں مارکس محفل کی جان ہوتے ہیں، سب سے زیادہ بذلہ سنج پر مزاح۔ وہ کوئی لطیفہ سن کر دل سے قہقہہ لگاتے۔ کوئی اچھا جملہ یا دلچسپ بات سنتے ہی ان کی گھنی پلکوں کے اندر سے جھانکتی ہوئی سیاہ آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتیں اور وہ اس سے خوب لطف اندوز ہوتے۔

وہ مشفق اور پیار کرنے والے باپ تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ بچوں کو اپنے والدین کی تربیت کرنی چاہیئے" وہ اپنی بیٹیوں کے لئے کبھی بھی پر رعب باپ نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بٹییوں کو ان سے غیر معمولی محبت تھی۔ اپنی بیٹیوں کو انہوں نے کبھی کوئی حکم نہیں دیا۔ اگر وہ چاہتے کہ ان کی بٹیاں کچھ کریں تو حکم دینے کے بجائے ان سے کہتے کہ اگر تم ایسا کردو تو مجھ پر عنایت ہوگی۔ اس طرح اگر وہ اپنی بیٹیوں کو کچھ کرنے سے روکنا چاہتے تو ایسا تاثر قائم کرتے جس سے وہ سمجھ جائیں۔ وہ اپنی بٹیوں کے ایسے مشفق باپ تھے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اسی لئے بیٹیاں باپ کو "فادر" پکارنے کے بجائے ان کی کینت "مور" سے پکارتی تھیں جس کا تعلق انکی سیاہ رنگت، سیاہ بال اور داڑھی سے تھا۔ دوسری طرف ۱۸۴۸ء سے پہلے کمیونسٹ لیگ کے ارکان انہیں "فادر مارکس" کے نام سے پکارتے تھے حالانکہ اس وقت ان کی عمر ۳۰ برس بھی نہیں تھی۔

مارکس اپنے بچوں کے ساتھ گھٹنوں کھیلتے تھے۔ انہیں آج بھی یاد ہے کہ کس طرح وہ ایک بڑے سے برتن میں پانی رکھ کر بحری جنگ کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ بچوں کے لئے کاغذی ناؤ بنائی جاتی تھی اور بچے انہیں چلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

ان کی بیٹیاں اتوار کو انہیں کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ وہ پورا دن ان کے لئے مختص ہوتا تھا۔ اگر موسم اچھا ہو تو پورا خاندان گھومنے کے لئے گھر سے باہر جاتا تھا۔ واپسی میں وہ کسی سستے سے ہوٹل میں رکتے جہاں روٹی، پنیر اور ادرک کی بیئر سے لنچ کرتے۔ جب بچیاں چھوٹی تھیں تو وہ لمبی مسافت کو چھوٹا کرنے کے لئے خود ساختہ پر تحیر کہانیاں سناتے، راستہ کی لمبائی کے مطابق وہ کہانی میں پیچیدگیاں پیدا کرتے اور انہیں کہانی میں اتنا محو کردیتے کہ وہ راستہ کی لمبائی کو بھول جاتیں۔

ان کی قوت تخیل بہت زبردست تھی۔ ان کی پہلی ادبی تخلیق نظم تھی۔ ان کی بیوی نے اپنے شوہر کی جوانی کی شاعری کو بہت حفاظت سے رکھا ہے مگر اسے کبھی کسی کو دکھایا نہیں۔ ان کے خاندان کا خیال تھا کہ وہ یا تو مصنف بنیں گے یا پھر پروفیسر ہوں گے۔ مگر جب انہوں نے سوشلسٹ آندولن میں حصہ لینا شروع کیا، جو جرمنی میں معتوب تھا، اور ریاسی معاشیات کو موضوع بنایا تو ان کے خاندان کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے راہرو ہو گئے ہیں۔

مارکس نے اپنی بیٹیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے لئے گریکی پر ایک ڈرامہ لکھیں گے۔ بدقسمتی سے وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے۔ اگر وہ یہ ڈرامہ لکھ پاتے تو یقیناً اس نکتہ نظر سے بہت دلچسپ

نمبر اگر کچوس ٹائبرس (۱۳۳۔۱۶۲ ق۔م) اور گرکچوس گاؤس (۱۲۱۔۱۵۳ ق۔م) دو رومی بھائی تھے جنھوں نے بڑی زمینداریوں پر حد بندی کے لئے قانون کی تشکیل کے لئے جدوجہد کی تھی۔

ہوتا کہ "طبقاتی جدوجہد کا عظیم شہنشاہ" ماضی کی اس عظیم اور دلچسپ طبقاتی جدوجہد کا کس طرح تجزیہ کرتا ہے۔ مارکس نے بہت سے منصوبے بنائے تھے، مگر ان میں سے کئی کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ دوسری چیزوں کے علاوہ منطق اور فلسفہ کی تاریخ پر بھی ایک ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ موخرالذکر موضوع ان کی جوانی میں ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اگر وہ اپنے تمام تخلیقی منصوبوں پر عمل کرتے تو انہیں کم سے کم سو برس اور جینا پڑتا۔ وہ دنیا کو یقیناً اپنے دماغ میں پوشیدہ جوہر کا ایک حصہ تو پیش کر ہی سکتے تھے۔

مارکس کی بیوی، حقیقی معنوں میں ان کی نصف بہتر وہ ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے اور دونوں کی پرورش ساتھ ساتھ ہوئی تھی۔ مارکس کی جب منگنی ہوئی تو ان کی عمر صرف سترہ برس تھی۔ منگنی کے بعد انہیں سات برسوں تک شادی کا انتظار کرنا پڑا۔ ۱۸۴۳ء میں ان کی شادی ہوئی اور اس کے بعد وہ کبھی الگ نہیں ہوئے۔

مارکس کی بیوی کی موت، مارکس کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہوئی۔ انہیں مساوات کا جتنا احساس تھا، اتنا کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا، حالانکہ ان کی پیدائش اور پرورش جاگیردار گھرانہ میں ہوئی تھی۔ ان کے لئے کسی سماجی تفریق کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ مزدوروں کی ان کے کام کاج کے لباس میں ہی اپنے ٹیبل پر اس طرح ضیافت کرتیں جیسے کہ وہ کوئی شہزادے یا نواب ہوں۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے کئی مزدوروں کو ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا مگر مجھے یقین ہے کہ ان میں کسی کو کبھی یہ شبہ نہیں ہوا ہوگا کہ ان کے ساتھ اتنی شرافت اور رواداری پیش آنے والی خاتون کا تعلق جرمنی کے مشہور جاگیردار خاندان، ڈیوک آف آرگل کے خاندان سے ہے، اور اسکا اپنا حقیقی بھائی پروشیا کے شاہ کے دربار میں وزیر ہے۔ انہیں اپنے ماضی سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اپنے کارل کی رفاقت کے لئے انہوں نے سب کچھ تیاگ دیا تھا۔ بدترین مشکلات کے دنوں میں بھی، انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ انہوں نے مارکس کے لئے جو کچھ چھوڑا ہے، وہ غلط تھا۔

وہ ایک صاف ذہن کی خاتون تھیں۔ دوستوں کو لکھے گئے بے تکلفانہ خطوط، فکر و خیال کے اچھوتے پن کی بہترین مثال ہیں۔ مسز مارکس کا خط ملنا، خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ جان فلپ بیکر[۲۱] نے ان کے کئی خطوط شائع کیے ہیں۔ بائینز، جو بہت ہی تیکھے طنز نگار تھے، مارکس سے گھبراتے

---

[۲۱] بیکر، جان فلپ (۱۸۰۹ - ۱۸۸۶ء)، جرمنی کے برتن بنانے والے، جرمنی اور بین الاقوامی مزدور تحریک کے ممتاز رکن، پہلے انٹرنیشنل کے رکن، مارکس اور اینگلز کے دوست اور معاون۔

تھے۔ مگر وہ ان کی بیوی کے گہرے حساس ذہن کے مداح تھے، جب مارکس پیرس میں تھے تو وہ باقاعدگی سے ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔

مارکس اپنی بیوی کی ذہانت اور تنقیدی نظر کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ اپنا ہر مسودہ انہیں دکھاتے اور ان کی تنقیدوں کو بہت زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے۔ یہ بات خود انہوں نے مجھ سے ۱۸۶۶ء میں کہی تھی۔ مارکس کی بیوی مسودہ کو اشاعت کے لئے بھیجنے سے پہلے ان کی نقل تیار کیا کرتی تھیں۔

مارکس کی اہلیہ کو کئی بچے ہوئے۔ ان میں سے تین کم عمری میں ہی فوت ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد مارکس کا خاندان انتہائی مصائب سے دوچار تھا۔ وہ لندن کی ڈین اسٹریٹ سوہو اسکوائر پر واقع دو کمروں کے مکان میں مہاجر کی طرح رہتے تھے۔ میں ان کی صرف تین بیٹیوں سے واقف ہوں۔ جب ۱۸۶۵ء میں پہلی مرتبہ میں مارکس سے ملا، تو چھوٹی بیٹی، جواب شریمتی الیونگ ہیں، بہت ہی پیاری، ننھی سی بچی تھی۔ وہ کشادہ کاندھوں والی بچی تھی، اسی لئے اکثر مارکس کہا کرتے تھے کہ میری بیوی سے اس کی پیدائش کے وقت غلطی ہو گئی۔ اسے تو لڑکا ہونا چاہئے تھا۔ ان کی باقی دو بچیاں، اس بچی سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھیں۔ بڑی بیٹی، شریمتی لونگیت کے باپ کی طرح سیاہ رنگت، سیاہ آنکھوں اور گھنے سیاہ بال والی ہیں، جب کہ دوسری بیٹی، جو میری بیوی ہیں کے گھنگریالے بالوں میں سنہرا پن ایسے جھلکتا ہے جیسے اس نے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو ضم کر لیا ہو۔ وہ اپنی ماں جیسی تھی۔

مارکس کے گھر کی ایک اہم فرد ہیلن ڈیموتھ تھی۔ کسان گھرانے میں پیدا ہونے والی یہ خاتون اس وقت شریمتی مارکس کی ملازمہ مقرر ہوئی تھیں جب وہ بچی تھی۔ مارکس کی شادی کے بعد، وہ مستقل طور پر ان کے ساتھ رہیں۔ مارکس جلاوطن ہو کر جہاں جہاں پہنچے وہ بھی ان کے ساتھ دربدر کی خاک چھانتی رہیں۔ وہ گھریلو معاملات کی بہترین منتظم تھیں اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیتی تھیں۔ یہ ان کا نظم و نسق اور گھریلو معیشت کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کی مہارت ہی تھی کہ مارکس کے خاندان کو کبھی بھی بنیادی ضرورتوں کی قلت محسوس نہیں ہوئی۔ گھر کا ایسا کوئی کام نہیں تھا جو وہ نہ کر سکتی ہوں، وہ کھانا پکاتیں، گھر کی صفائی کرتیں، بچوں کو نہلاتی دھلاتیں اور ان کے کپڑے کاٹ کر شریمتی مارکس کے ساتھ سیتیں۔ وہ گھر کی خادمہ تھیں اور گھر کی سربراہ بھی۔ پورا گھر ان کے ہی دم سے چلتا تھا۔ بچے ان سے ماں کی طرح پیار کرتے۔ وہ بچوں سے بھی ایسی مادرانہ شفقت سے پیش آتی تھیں کہ خود بخود بچے انہیں ماں کی جگہ ماننے لگے تھے۔ شریمتی مارکس انہیں اپنا دوست مانتیں اور مارکس نے بھی ان کے ساتھ مخصوص رشتے قائم کر لئے تھے۔ وہ اکثر ان سے شطرنج کھیلتے اور زیادہ تر موقعوں پر ہار بھی جاتے۔

ہیلن کو مارکس کے خاندان سے اندھی عقیدت اور محبت تھی۔ یہ خاندان جو کچھ کرے وہ ان کے لئے درست تھا۔ اگر مارکس پر کوئی تنقید کرتا تو وہ سینہ سپر ہو جاتیں۔ جو کوئی مارکس کے خاندان میں شامل ہوتا، اس کے ساتھ بھی ان کا ایسا ہی ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ ہوتا۔ ایسا لگتا تھا کہ مارکس کے پورے خاندان کو انہوں نے گود لے لیا ہے۔ وہ مارکس اور ان کی بیوی کی وفات کے بعد بھی زندہ رہیں اور ان دونوں کی موت کے بعد انہوں نے اینگلز کے خاندان کو اپنی شفقت سے نوازا۔ وہ اینگلز کو اس وقت سے جانتی تھیں جب وہ بچی تھیں۔ اینگلز کے ساتھ ان کا وہی محبت بھرا سلوک رہا، جو مارکس کے خاندان کے ساتھ تھا۔

اینگلز بھی تو آخر، مارکس کے خاندان کے ہی ایک فرد تھے۔ مارکس کی بیٹیاں انہیں اپنا ثانوی باپ کہتی تھیں۔ وہ مارکس کے ہمزاد تھے۔ عرصہ سے جرمنی میں ان دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے اور تاریخ میں بھی اب یہ نام ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے۔

مارکس اور اینگلز کی دوستی، روایتی داستانوں اور شاعری میں پیش کی گئی مثالی دوستی کی زندہ جاوید مثال تھی۔ اپنی جوانی کے دنوں سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے ایک دوسرے کے متوازی مگر مشترکہ زندگی گذارتے رہے۔ وہ نہ صرف دوست تھے بلکہ ان کے نظریات یکساں تھے، ایک انقلابی آندولن کے ہم سفر تھے اور جب تک ساتھ رہے مل کر کام کرتے رہے۔ اگر حالات نے انہیں ۲۰ سال کے لئے جدا نہ کر دیا ہوتا تو وہ ساری زندگی مل کر کام کرتے رہتے۔ مگر ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی شکست کے بعد اینگلز کو مانچسٹر جانا پڑا اور مارکس لندن میں ہی رہے۔ پھر بھی وہ روزانہ ہی ایک دوسرے کو خط لکھ کر اپنی مشترکہ ذہنی کاوشوں کو جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔ اپنے خطوط میں انہوں نے ایک دوسرے کو سیاسی اور سائنسی واقعات اور اپنی تخلیقات پر اپنے اپنے نظریات سے واقف کروایا۔ مانچسٹر میں کام سے، جیسے ہی اینگلز کو فراغت ملی، وہ لندن واپس آ گئے۔ انہوں نے مارکس کے گھر سے صرف دس منٹ کی مسافت کے فاصلے پر اپنا گھر بنایا۔ ۱۸۷۰ء کے بعد، مارکس کی موت تک کوئی ایسا دن نہیں گذرا جب دونوں دوستوں کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ کبھی ایک دوسرے کے گھر چلا جاتا اور کبھی وہ اس کے گھر آ جاتا۔

مارکس کے خاندان کے لئے وہ زبردست خوشی کا دن تھا جب اینگلز نے اطلاع دی کہ وہ مانچسٹر سے لندن منتقل ہو رہے ہیں۔ اینگلز کی متوقع آمد کے بارے میں بہت دنوں تک باتیں ہوتی رہیں اور جس دن وہ آنے والے تھے اس دن مارکس اس قدر بے چین تھے کہ ان سے کوئی کام نہیں ہو سکا۔ اینگلز کے آنے کے بعد اس رات دونوں دوست، ساری رات سگریٹ پھونکتے، پیتے رہے اور ان تمام واقعات پر بات کرتے رہے جو ان کی پچھلی ملاقات کے بعد ہوئے تھے۔

مارکس، اینگلز کی رائے کو کسی بھی دوسرے شخص کی رائے سے زیادہ اہم مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اینگلز ہی وہ شخص ہیں جو حقیقی معنوں میں ان کے شریک کار ہو سکتے ہیں۔ مارکس سامعین کے کسی بڑے مجمع میں تقریر اور اینگلز سے بات چیت کو مساوی درجہ دیتے تھے۔ اینگلز کو کسی بات کا قائل کرنے اور اپنا ہمنوا بنانے کے لئے، انہیں خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنی پڑے وہ اسے فضول نہیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ البی جنیس* کی جنگ کے متعلق کسی ثانوی نکتہ پر اینگلز کو اختلاف تھا۔ وہ نکتہ تو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، مگر مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اینگلز کو اس نکتہ پر قائل کرنے کے لئے مارکس نے اس موضوع پر کئی کتابوں کو کھنگال ڈالا۔ اگر اینگلز ان کی رائے سے متفق ہو جاتے تو مارکس کے لئے یہ سب سے بڑی فتح ہوتی۔

مارکس کو اینگلز پر فخر تھا۔ وہ اس کی اخلاقی اور دانشورانہ قابلیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مجھے اینگلز سے متعارف کروانے کے لئے خاص طور سے میرے ساتھ مانچسٹر کا سفر کیا۔ وہ ان کے ذہن رسا کے دلدادہ تھے۔ انہیں کسی چیز سے گزند نہ پہنچے، اس وہ بہت گھبراتے تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے "میں ڈرتا ہوں کہیں، اسے کوئی حادثہ نہ ہو جائے، وہ کسی بھی رکاوٹ سے ڈرے بغیر، آگے بڑھتا جاتا ہے، اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں کسی چیز سے ٹکرا کر گر نہ جائے۔"

مارکس اتنے ہی اچھے دوست تھے جتنے پیارے شوہر اور باپ تھے۔ اپنی بیوی، بچیوں، ہیلن اور اینگلز میں انہوں نے ان شخصیتوں کو پالیا تھا جن سے ان جیسا شخص پیار کر سکتا ہے۔

(۳)

مارکس نے اپنی زندگی کا آغاز ریڈیکل بورژوازی کے لیڈر کی حیثیت سے کیا تھا مگر جیسے ہی انہوں نے بورژوازی سے اپنے اختلافات کو ظاہر کیا، انہیں یکا و تنہا چھوڑ دیا گیا اور جب وہ سوشلسٹ ہو گئے تھے پھر انہیں دشمن سمجھا جانے لگا۔ انہیں جرمنی میں برا بھلا کہا گیا، ملک بدر کر دیا گیا، پھر ایک لمبے عرصے تک ان کے اور ان کی تخلیقات کے تعلق سے مجرمانہ خاموشی کی سازش رچی گئی۔ ۱۸۰ء میں

البی جنس کی جنگ ۱۲۰۹ء سے ۱۲۲۹ء کے دوران لڑی گئی۔ یہ جنگ شمالی فرانس کے جاگیرداروں نے پوپ کی مدد سے جنوبی فرانس کے تبدیلی پسندوں کے خلاف چھیڑی تھی۔ یہ جنگ جنوبی فرانس کے شہر البی کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہے۔ جنوبی فرانس میں آباد تاجر اور دستکار، جاگیرداروں کے خلاف تھے اور مہنگی کیتھولک رسموں و رواج میں تبدیلیوں کے حامی تھے۔ اس کے لئے انہوں نے مذہبی انداز کی مہم شروع کی تھی۔

برو مائر نامی کتاب میں مارکس نے ثابت کیا کہ ۱۸۴۸ء تک وہ واحد مورخ اور سیاستداں تھے جنھوں نے ۲ر دسمبر ۱۸۵۱ء[1] کی بغاوت کے حقیقی کارکنوں اور نتائج کو سمجھا اور اجاگر کیا تھا۔ ان حقائق کی سچائی کے باوجود کسی سرمایہ دار اخبار نے ان کی اس تصنیف کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

اسی طرح افلاس کے فلسفہ[2] نامی کتاب کے جواب میں لکھی گئی کتاب فلسفہ کا افلاس اور سیاسی معاشیات پر ان کی تنقیدی تحریر کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ پندرہ سال کی مجرمانہ خاموشی کو، پہلے انٹرنیشنل اور سرمایہ کی پہلی جلد نے توڑ دیا۔ اب مارکس کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ پہلے انٹرنیشنل کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے کامیابیوں کی نئی داستان رقم کی۔ حالانکہ مارکس پس منظر میں تھے اور انہوں نے دوسروں کو آگے آنے کا موقع دیا تھا، مگر بہت جلد دنیا نے پتہ لگا لیا کہ اس سب کے پیچھے کون ہے۔

جرمنی میں سوشیل ڈیموکریٹک پارٹی قائم ہوئی۔ وہ اتنی طاقتور ہو گئی تھی کہ بسمارک[1] نے اس پر حملہ کرنے سے پہلے اس سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لسالے[2] پیروکار شیوزر نے سرمایہ کے تعارف کے لئے کئی مقالے لکھے جن کی مارکس نے بھی بہت تعریف کی ہے۔ جان فلپ بیکر کی پہل پر انٹرنیشنل کی کانگریس نے ایک خصوصی قرارداد منظور کر کے تمام ملکوں کے سوشلسٹوں کو "سرمایہ" کی طرف متوجہ کیا اور اسے "مزدور طبقہ کی بائیبل" قرار دیا۔[3]

نمبر ۱۔ دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو نپولین اوّل، فرانسیسی جمہوریہ کے صدر کے بھتیجے لوئی بوناپارٹ نے بغاوت کر دی، قانون ساز اسمبلی کو برخاست کر کے خود کو تاحیات صدر مقرر کرنے کا اعلان کر دیا ۲ر دسمبر ۱۸۵۲ء کو اس نے اعلان کیا کہ وہ شہنشاہِ فرانس ہے اور نپولین سوّم کا لقب اختیار کر لیا۔

نمبر ۲۔ افلاس کا فلسفہ ٹٹ پونجئے پیٹی بورژوا مفکر پرودھوں کی تصنیف ہے۔

نمبر ۱۔ اوٹو بسمارک (۱۸۱۵۔۱۸۹۸ء) کے پروشیا کے مدبر رہنما، ۱۸۷۱ء سے جرمن شہنشاہیت کے چانسلر۔

نمبر ۲۔ لسالے فرڈینڈ۔ (۱۸۲۵۔۱۸۶۴ء) جرمنی کا ایک پیٹی بورژوا سوشلسٹ جس نے ۱۸۶۳ء میں جنرل ایسوسی ایشن آف جرمن ورکرز نامی تنظیم قائم کی تھی۔ مارکس اور اینگلز نے لسالے کے نظریات، حکمت عملی اور تنظیمی اصولوں پر زبردست نکتہ چینی کی ہے اور انہیں جرمنی کے مزدور طبقہ کی تحریک کا موقع پرستانہ قرار دیا۔

نمبر ۳۔ یہ قرارداد پہلے انٹرنیشنل کی برسلز کانگریس میں ستمبر ۱۸۶۸ء میں منظور کی گئی۔

۱۸ر مارچ ۱۸۷۱ء کے انقلابی ابھار، جس میں لوگوں نے پہلے انٹرنیشنل کی کاوشوں کو عملی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی اور پیرس کمیون کی شکست کے بعد، جس کی ذمہ داری پہلے انٹرنیشنل کی جنرل کونسل نے اپنے سر لے لی تھی، تاکہ اسے تمام ملکوں میں سرمایہ داروں کے اخبارات کے حملوں سے بچایا جا سکے، ساری دنیا مارکس کے نام سے واقف ہو گئی۔ انہیں سائنسی سوشلزم کے سب سے عظیم نظریہ ساز اور مزدور طبقہ کی پہلی بین الاقوامی تحریک کے آرگنائیزر کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔

سرمایہ، سب ہی ملکوں میں سوشلسٹوں کے لئے بائیبل کا درجہ حاصل کر گئی۔ مزدور طبقہ اور سوشلسٹوں کے تمام اخبارات نے اس کے سائنسی نظریات کی تشہیر کی۔ نیو یارک میں ایک بڑی ہڑتال کے دوران سرمایہ سے اقتباسات بطور اشتہار چھاپے گئے تاکہ مزدوروں میں حوصلہ پیدا کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ انکی مانگیں کتنی منصفانہ ہیں۔

سرمایہ کا اہم یورپی زبانوں۔ روسی، فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ اس کے اقتباسات جرمن، اطالوی، فرانسیسی، اسپینش اور ولندیزی زبانوں میں شائع ہوئے۔ جب کبھی یورپ یا امریکہ میں مخالفین نے ان کے نظریات کی تردید کرنے کی کوشش کی، ماہرین معاشیات کو سوشلسٹوں سے ایسا جواب ملتا کہ زبان گنگ ہو جاتی۔ آج سرمایہ فی الواقعی، جیسا کہ پہلے انٹرنیشنل کی کانگریس نے کہا تھا، مزدور طبقہ کی بائیبل بن گئی ہے۔

بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک میں عملی حصہ بٹانے کے لئے مارکس کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو بند کرنا پڑتا تھا۔ ان کی بیوی اور بڑی بیٹی شرمیتی لنگویت کی موت کا بھی ان پر بہت برا اثر پڑا تھا۔

اپنی بیوی کے لئے مارکس کی محبت گہری اور مثالی تھی۔ اس کا حسن مارکس کیلئے باعث فخر و انبساط تھا، ان کی شائستگی اور خود کو وقف کر دینے کی خاصیت نے مارکس کے لئے مصائب کے دنوں کی تاریک راہوں کو روشن کر دیا تھا۔ یہ مصائب ان کی واقعات سے بھرپور انقلابی زندگی کی پیداوار تھے۔ جس موذی مرض نے جینی مارکس کی زندگی لی، اس نے ہی مارکس کی زندگی کے دن بھی کم کر دیئے۔ جینی مارکس کی طویل بیماری کے دوران مارکس نے کئی راتیں جاگ کر گذار دیں، وہ روزانہ کی ورزش اور کھلی ہوا سے بھی محروم ہو گئے تھے، اس کی وجہ سے نقاہت بڑھی اور وہ نمونیہ کا شکار ہو گئے جس نے مارکس کو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔

۲ر دسمبر ۱۸۸۱ء کو شرمیتی مارکس، اپنی زندگی کی ہی طرح کمیونسٹ اور مادیت پسند کی موت مریں۔ موت سے وہ بالکل خوفزدہ نہیں تھیں۔ جب آخری وقت آ پہنچا تو انہوں نے مارکس سے کہا "کارل، اب میری قوت ختم ہو رہی ہے۔" یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔

انہیں ۵ر دسمبر کو ہائی گیٹ قبرستان کے ایک عام سے میدان میں دفن کیا گیا۔ ان کی اور مارکس

کی عادات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان کی تدفین کے واقعہ کی تشہیر نہیں کی گئی۔ صرف بہت ہی قریبی دوستوں نے انہیں، ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔ مارکس کے قدیم رفیق، اینگلز نے ان کی قبر پر آخری تقریر کی۔

بیوی کی موت کے بعد مارکس کی زندگی جسمانی اور روحانی اذیتوں کی آماجگاہ بن گئی۔ جس کا انہوں نے پوری جرات اور ہمت سے مقابلہ کیا۔ ایک سال بعد ان کی بڑی بیٹی شرمیتی لنگویت کی وفات نے انہیں اور کمزور کر دیا۔

۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو ۶۴ سال کی عمر میں انہوں نے اپنی لکھنے کی میز پر آخری سانس لی۔

ویلہلم لیبنخت

مارکس۔ کچھ یادیں یادیں

مجھ سے سینکڑوں بار یہ کہا گیا ہے کہ مارکس اور ان سے اپنے ذاتی تعلقات کے بارے میں کچھ لکھوں، مگر میں نے ہر بار انکار کر دیا۔ انکار میں نے مارکس کے لئے اپنے احترام کے پیش نظر کیا، مجھے خدشہ تھا کہ یہ کام بہت اہم ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں موضوع سے انصاف کر سکوں۔ مارکس کے بارے میں سرسری طور پر، جلد بازی میں کچھ لکھنا، مارکس کی ہتک ہوگی۔

مگر مجھ سے لوگوں نے کہا کہ جب ہم خاکہ لکھ رہے ہوں تو ضروری نہیں ہے کہ وہ سرسری نہ ہو، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو صرف میں ہی مارکس کے بارے میں کہہ سکتا ہوں؛ اس کے علاوہ جو چیز بھی ہمارے مزدوروں اور پارٹی کے لئے مارکس کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اس کا ضابطۂ تحریر میں لانا قابل قدر ہوگا۔ اور اگر انتخاب ان دو چیزوں میں سے ہو کہ یا تو مارکس پر کچھ بھی نہ لکھا جائے یا پھر جو کچھ ممکن ہو، وہ لکھ دیا جائے، خواہ وہ بھرپور نہ ہو، تو پھر موخرالذکر کا انتخاب ہی بہتر ہوگا۔ ان سب دلیلوں کے سامنے مجھے جھکنا ہی پڑا۔

مارکس، جو سائنسداں تھے RHEINISCHE ZEITUNG کے ایڈیٹر DEUTSCH FRANZOSISCH JAHRBUCHER اور کمیونسٹ مینی فیسٹو کے مصنفین میں سے ایک تھے NEU RHEINISCH ZEITUNG کے ایڈیٹر اور سرمایہ جیسی لافانی تخلیق کے خالق تھے، وہ دراصل عوامی اثاثہ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مارکس کے بارے میں لکھنا حماقت ہوگی، کیونکہ میں اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں سے جو وقت چرا پاؤں گا اس میں، مارکس کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے زبردست تحقیقی کام ضروری ہے،

ویلہلم لیبنخت (۱۸۲۶ء – ۱۹۰۰ء) جرمنی کی اور بین الاقوامی مزدور تحریک کے ممتاز رہنما، جرمنی میں سوشیل ڈیموکریسی کے بانی رہنماؤں میں سے ایک، مارکس اور اینگلز کے معاون اور دوست۔
یہ مضمون پہلی مرتبہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔

اس کے لئے میرے پاس وقت کہاں ہے۔؟

اس لئے اس مختصر سے خاکہ میں میں سائنسداں اور سیاستداں مارکس کا، ان کی زندگی اور واقعات کا محض حوالہ دوں گا۔ مارکس کی زندگی کا یہ پہلو سب پر نمایاں ہے۔ میں تو مارکس کا 'بحیثیت ایک انسان جائزہ لوں گا۔ میں اس مارکس کی بات کروں گا جسے میں جانتا تھا۔

مارکس سے پہلی[1] ملاقات

مارکس کی دونوں بڑی بیٹیوں سے ۔ جو اس وقت چھ اور سات سال کی بچیاں تھیں ۔ میری دوستی، لندن آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہو گئی تھی ۔ میں آزاد سوئیٹزرلینڈ" کی جیل سے رہا ہو کر ایک جبری پاسپورٹ کے ذریعہ فرانس ہوتا ہوا لندن پہنچا تھا۔ مارکس کے خاندان سے میری ملاقات کمیونسٹ ورکرز ایجوکیشن سوسائٹی[1] کے گرمائی میلے میں ہوئی تھی ۔ یہ میلہ لندن کے قریب کسی مقام پر ہوا تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ یہ جگہ گرین وچ تھی یا ہمپٹن کورٹ ۔

" پیرے مارکس" جنھیں، میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا' پہلی ملاقات میں انہوں نے میرا بغور جائزہ لیا، انہوں نے میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جیسے وہ میرے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں ۔

اس تحقیقاتی جائزہ" کا نتیجہ میرے حق میں رہا۔ اس کا اندازہ میں اس شیر جیسے سر اور سیاہ گھنے بالوں والے فرد کی آنکھوں کی چمک سے لگا سکا تھا۔ جائزہ کے بعد ہی' ہماری بات چیت کا آغاز ہوا اور جلد ہی ہماری گفتگو بے تکلفی کی حد کو چھونے لگی ۔ مارکس کا انداز سب سے زیادہ غیر رسمی اور بے تکلفانہ تھا۔ فوری طور پر میرا تعارف مارکس کی اہلیہ ان کے گھر کی منتظم لینچن جو اس وقت سے ان کے خاندان کے ساتھ تھی جب وہ بچی تھی اور بیٹیوں سے کرایا گیا۔ اس کے بعد سے مارکس کا گھر میرے لئے اجنبی نہیں رہا۔ اس ملاقات کے بعد' ایک بھی دن ایسا نہیں گذرا جب میں ان کے گھر نہیں گیا۔ وہ آکسفورڈ اسٹریٹ سے ہٹ کر ڈین اسٹریٹ پر رہتے تھے میں نے چرچ اسٹریٹ پر رہائش اختیار کی جو انکے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔

پہلی[2] گفتگو

ابھی میں نے جس میلہ کا تذکرہ کیا ہے، وہاں پہلی ملاقات کے بعد مارکس سے میری پہلی تفصیلی

نمبر ۱- جرمن ورکرز ایجوکیشن سوسائٹی ۱۸۴۰ء میں لندن میں قائم کی گئی تھی۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۰ء کے دوران اور اس کی بعد کی دہائیوں کے دوران، اس پر مارکس کا اثر فیصلہ کن تھا۔

بات چیت دوسرے دن ہوئی۔ ظاہر ہے میلہ میں ہم سنجیدہ موضوعات پر بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے مارکس نے کہا کہ میں اگلے دن ایجوکیشن سوسائٹی کی عمارت میں آجاؤں، تب تفصیلی بات چیت ہو گی۔ امید تھی کہ وہاں اینگلز بھی ہوں گے۔

میں مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ مارکس اس وقت نہیں آئے تھے۔ وہاں میرے کچھ پرانے آشنا بھی موجود تھے۔ میں ان سے بات چیت میں محو ہو گیا۔ اچانک مارکس آئے اور انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکی سی تھپکی دی۔ دوستانہ انداز میں بتایا کہ اینگلز نیچے پرائیویٹ ہوٹل روم میں بیٹھے ہیں۔ چلو وہاں ہی چلتے ہیں، وہاں زیادہ بے تکلفی سے بات چیت ہو سکے گی۔

اس وقت تک مجھے پرائیوٹ ہوٹل روم کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں سمجھا کہ اب امتحان کا وقت آگیا ہے۔ مگر میں پُراعتماد انداز میں مارکس کے ساتھ چلتا رہا۔ ان کا رویہ میرے ساتھ ویسا ہی ہمدردانہ تھا جیسا پچھلے دن۔ وہ لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دیا اور مجھے اس جگہ لے گئے جہاں اینگلز بیٹھے ہوئے، ایک مگ میں کسی مشروب سے شغل کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑی خوش دلی سے میرا خیر مقدم کیا۔

بار کے ملازم ، کو فوری طور پر کچھ پینے اور کھانے کے لئے لانے کا حکم دیا گیا۔ ان دنوں ہم مہاجرین کے لئے کھانا بنیادی مسئلہ تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ میز کے ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف مارکس اور اینگلز۔ وسیع اور کشادہ میز، خوبصورت سجاوٹ اور بھرپور انگریزی ناشتہ کی امید اور وہ سب کچھ جو اس کے ساتھ ہوتا ہے، پھر طلب کرنے پر تمباکو نوشی کے لئے مٹی کے پائپ، ان سب نے مجھ پر بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ میں خود کو اس قدر آرام دہ حالت میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے ایک انگریزی تصویر کی یاد آنے لگی۔ ان سب کے باوجود، میرے ذہن پر یہ خیال حاوی تھا کہ آج میرا امتحان ہونے والا ہے۔ میں نے دل میں سوچا، ٹھیک ہے، میں اس سے بھی نمٹ لوں گا۔ پھر بات چیت کرنا آسان ہو گیا۔

ایک سال پہلے جنیوا میں اینگلز سے ہوئی ملاقات کے سوا میرا مارکس اور اینگلز سے کوئی شخصی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں صرف مارکس کے اخباری مضامین جو پیرس کے اخبار میں شائع ہوئے تھے، ان کی کتاب فلسفہ کا افلاس اور اینگلز کی تصنیف برطانیہ میں مزدور طبقہ کی حالت ہی پڑھ سکا تھا۔ میں ۱۸۴۹ء سے کیمونسٹ تھا۔ اینگلز سے جنیوا میں ملاقات سے کچھ عرصہ پہلے ہی میں کمیونسٹ مینی فیسٹو کی ایک کاپی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ہماری یہ ملاقات اپریل دستوری ۱۸۴۰ء کے بعد ہوئی تھی۔ ویسے میں اس سے پہلے ہی کمیونسٹ مینی فیسٹو کا تذکرہ سن چکا تھا اور اس کے مواد سے واقف تھا جہاں تک نیوے رہائنش زوتنگ (اخبار کا نام) کا تعلق تھا، گیارہ مہینے کی مدت کے دوران، اس کی اشاعت ہوئی، اس مدت میں، میں زیادہ تر ملک سے باہر رہا، جیل میں رہا، یا ایک باغی رضاکار کی حیثیت

سے انتہائی افراتفری کی زندگی گذارتا رہا تھا۔

میرے دونوں ممتحن کو شبہ تھا کہ میں پتی بورژوا "جمہوریت" کا طرفدار ہوں یا "جنوبی جرمنی کے امن پسندی" کا شکار ہوں۔ لوگوں اور واقعات کے بارے میں' میں نے جو رائے ظاہر کی، اس کی زبردست تنقید کی گئی۔ بحیثیت مجموعی' میں' امتحان میں فیل نہیں ہوا۔ اور پھر بات چیت زیادہ وسیع موضوعات پر ہونے لگی۔۔۔۔

جلد ہی ہم نیچرل سائنس کے موضوع پر آ گئے۔ مارکس نے یورپ میں فتح مندی کے اس احساس کا تذکرہ کیا کہ وہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ انقلاب کا گلا گھونٹنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، مگر شاید انہیں پتہ نہیں کہ نیچرل سائنس ایک اور انقلاب کی راہ ہموار کر رہی ہے۔ شاہ دخان (بھاپ) جنہوں نے ایک صدی قبل، ساری دنیا میں ایک انقلاب بپا کر دیا تھا، اب اپنی انفرادیت کھونے لگے ہیں اور اب بجلی کی چمک' زیادہ انقلابی عنصر کی حیثیت سے سامنے آ رہی ہے۔ مارکس نے مجھے بڑے پر جوش انداز میں بجلی سے چلنے والے اس انجن کے ماڈل کے بارے میں بتایا جو پچھلے کچھ دنوں سے ریجنٹ اسٹریٹ پر نمائش کے لئے رکھا ہوا ہے جو پوری ایک ٹرین کو کھینچ سکتا ہے۔

انہوں نے کہا "اب مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اس کے نتائج کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ معاشی انقلاب کے بعد سیاسی انقلاب ناگزیر ہے کیونکہ سیاسی انقلاب' معاشی انقلاب کا ہی ایک مظہر ہے۔۔۔۔

مارکس نے جس انداز میں سائنس اور مرکبات کی ترقی کے بارے میں بات چیت کی وہ ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرتی تھی۔ بعد میں اسے ہی تاریخ کے مادی تصور کا نام دیا گیا۔ اس نقطۂ نظر کے تعلق سے اس وقت تک جو میرے ذہن میں شک و شبہات تھے وہ سورج کی کرنوں کے ساتھ پگھلنے والے برف کی طرح سے دور ہو گئے۔

اس شام میں گھر نہیں لوٹا، ہم اس وقت تک کھاتے پیتے اور بات کرتے رہے' جب تک کہ دن نکل آیا۔ میں اس وقت بستر پر پہنچا، جب کہ سورج اچھی طرح نمودار ہو چکا تھا۔ مگر میں زیادہ دیر تک بستر پر نہیں ٹھہر سکا۔ میرا ذہن ان تمام خیالات سے بھرا ہوا تھا' جو میں نے اس دن سنے تھے۔ خیالات کا ایک ریلا تھا جو مجھے بے چین کیا ہوا تھا۔ اس لئے میں بستر سے اٹھ کر ریجنٹ اسٹریٹ چلا گیا تاکہ اس نئے انجن کے ماڈل کو دیکھ سکوں جو سرمایہ دارانہ معاشرے نے اپنی خودکشی کے لئے تیار کیا ہے اور جو بالآخر ان کی تباہی

نمبر۱۔ ایک انقلابی جدوجہد جو ۱۸۴۸ء کے موسم بہار اور گرما میں جنوب۔ مغربی جرمنی میں کل جرمنی (جسے امپیریل جرمنی بھی کہا جاتا تھا) دستور کے لئے شروع کی گئی تھی۔

کا سبب بن جائے گا۔ وہ دن دور نہیں، جب تخت و تاج گریں گے اور اچھالے جائیں گے۔

ریجنٹ اسٹریٹ پر بہت ہجوم تھا۔ میں ہجوم کے دھکے سہتے ہوئے اس انجن کے پاس پہنچا جو نمائش کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس کے گرد ٹرین چل رہی تھی۔

یہ ۱۸۵۰ء کی جولائی کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔

(۳)

مارکس۔ انقلابیوں کے استاد اور اتالیق

"مور" ہم "نوجوانوں" سے پانچ یا چھ سال بڑے تھے۔ ان کی بالغ نظری نے انہیں ہم پر جو برتری عطا کی تھی، وہ اس سے بخوبی واقف تھے اور اکثر ہمیں، بالخصوص مجھے درس دیا کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور یادداشت بلا کی تھی، اس لئے اکثر ہمارے لئے مشکلات کا سبب بن جاتے۔ وہ ہم میں سے کسی بھی "طالب علم نوجوان" کو کوئی مشکل سوال دیتے۔ اور جب اس سے جواب نہیں بن پڑتا تو وہ لطف لیتے اور کہتے کہ اس سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں اور نصابی اداروں کی تعلیم کتنی لغو اور فضول ہے۔

وہ ہمیں درس دیتے۔ ان کا طریقۂ تعلیم منصوبہ بند تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے استاد تھے۔ لفظ "استاد" کے وسیع تر اور [illegible] معنے لئے جاتے ہیں، ان دونوں ہی معنوں میں وہ میرے استاد تھے۔ ان کی تدریس کو محض سیاسی معاشیات کے موضوع تک محدود کرنا غلط ہوگا۔ وہ تو علم کے بحر بیکراں تھے۔ کمیونسٹ لیگ میں، ان کے لیکچروں کے بارے میں میں بعد میں آپ کو بتاؤں گا۔ مارکس جدید اور قدیم زبانیں، دونوں ہی بڑی آسانی سے پڑھ اور سمجھ لیتے تھے۔ میں خود ماہر لسانیات تھا۔ مارکس اس وقت بہت لطف اندوز ہوتے، جب وہ مجھے ارسطو یا کسی دوسرے فلسفی کا کوئی مشکل سا اقتباس دکھاتے اور میں اسے جلد ہی نہیں سمجھ پاتا۔ ایک دن جب انہیں پتہ چلا کہ میں ہسپانوی زبان نہیں جانتا تو انہوں نے مجھے خوب برا بھلا کہا اور پھر ایک ڈھیر میں سے "ڈان کانکیوٹ" نکال کر مجھے درس دینا شروع کر دیا۔ میں [illegible] کی [illegible] زبانوں کی مقابلی قواعد کی کتاب کے بنیادی اصولوں سے پہلے ہی سے [illegible] ان کی ہدایت میں نیا سبق سیکھنے میں کوئی دقت نہیں [illegible] الجھن ہوتی تو وہ میری مدد کرتے۔ عام طور سے وہ بڑے گرم [illegible] کسی کو پڑھاتے تو ان سے صابر اور برداشت کرنے والا ٹیچر اور کوئی ہوتا [illegible] سا تھا۔ درس و تدریس کا سلسلہ اسی وقت منقطع ہوتا جب کوئی ملاقاتی آجاتا۔ روزانہ ہی مجھے "ڈان کانکیوٹ" یا کسی دوسری ہسپانوی کتاب کا کوئی اقتباس ترجمہ کرنا پڑتا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک انہوں نے یہ محسوس نہیں کر لیا کہ اب میں ہسپانوی زبان میں بھی مہارت حاصل کر چکا ہوں۔

مارکس بلا کے ماہر لسانیات تھے۔ قدیم زبانوں کے مقابلے میں انہیں جدید زبانوں کے بارے میں زیادہ جانکاری تھی۔ میں خود ماہر لسانیات ہوں مگر گرم کی جرمن قواعد سے اور اس کے بھائی کی تیار کردہ لغت کے بارے ان کی جانکاری مجھ سے زیادہ تھی۔ وہ کسی انگریز یا فرانسیسی کی طرح انگریزی یا فرانسیسی میں لکھ لیتے۔ گفتگو ذرا مشکل تھی کیونکہ ان کا تلفظ اچھا نہیں تھا نیویارک ڈیلی ٹریبون کے لئے وہ کلاسیکی انگریزی میں مضامین لکھا کرتے تھے جب کہ فرانسیسی مفکر پرودھون کی کتاب "افلاس کا فلسفہ" کے جواب میں انہوں نے جو کتاب "فلسفہ کا افلاس" لکھی وہ کلاسیکی فرانسیسی میں ہی لکھی گئی۔ طباعت سے پہلے انہوں نے جس فرانسیسی دوست کو اس کا مسودہ دکھایا تھا، اس میں اس کے لئے درستگی کے لئے بہت کم گنجائش تھی۔

چونکہ مارکس زبانوں کی روح، ان کے ارتقاء کی تاریخ اور بناوٹ سے واقف تھے اس لئے ان کے لئے نئی زبان سیکھنا مشکل نہیں تھا۔ لندن کے قیام کے دوران انہوں نے روسی سیکھی۔ کریمیائی جنگ[1] کے دوران وہ عربی اور ترکی بھی سیکھنا چاہتے تھے مگر ایسا نہیں کر پائے۔ زبان سیکھنے والے ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ سب سے زیادہ اہمیت مطالعہ کو دیتے تھے۔ ایک اچھی یادداشت والا شخص، (مارکس کی یادداشت تو اتنی اچھی تھی کہ جو چیز ایک مرتبہ پڑھ لیتے اسے بھولتے نہیں) جلد ہی نئی زبان کے ذخیرۂ الفاظ اور محاروں سے واقف ہو جائے گا۔ تب وہ ان کے عملی استعمال کو بھی آسانی سے سیکھ لے گا۔

۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء کے دوران مارکس نے سیاسی معاشیات کے موضوع پر لیکچر دیئے۔ ابتداء میں وہ ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے۔ مگر ایک مرتبہ جب وہ اپنے انتہائی قریبی دوستوں کے سامنے تقریر کرنے کے عادی ہو گئے تو پھر انہوں نے ہمیں اجازت دے دی کہ اب زیادہ تعداد میں سامعین کے لئے لیکچر بھی منظم کئے جا سکتے ہیں۔ ان نصابی لیکچروں کے تمام شرکا ء اس سے فیضیاب ہوئے اور پورا لطف اٹھایا۔ ان ہی لیکچروں کے دوران انہوں نے ان معاشی اصولوں کو فروغ دیا جو بعد میں "سرمایہ" میں پیش کئے گئے ہیں۔ مارکس کے لیکچرز کے دوران کمیونسٹ ایجوکیشنل سوسائٹی کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔ اس وقت یہ ہال گریٹ ریڈ مل اسٹریٹ پر تھا۔ اسی ہال میں سال ڈیڑھ سال پہلے کمیونسٹ مینی فسٹو کی توثیق کی گئی تھی۔ ان لیکچروں کے دوران مارکس نے علم کے فروغ اور مقبولیت میں زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ وہ سائنس کو اس کی اصل بنیاد اور ماہیت سے دور کرنے کے جتنے

نمبر ۱۔ کریمیا یا مشرق کی جنگ ۵۶-۱۸۳۶ء کے دوران روس نے مشرق وسطیٰ پر غلبہ کے لئے برطانیہ، فرانس، ترکی اور سرڈانیا کے خلاف چھیڑی تھی۔ اس جنگ میں روس کو شکست ہوئی۔

مخالف تھے، اتنا بڑا مخالف تو شاید کوئی اور نہیں تھا۔ مارکس کو اپنے خیالات کے اظہار پر جو ملکہ حاصل تھا وہ شاید کسی اور کو نہیں تھا۔ وہ اپنی بات بالکل دو ٹوک الفاظ میں پیش کرتے دراصل تقریر کی اثر آفرینی، نظریات اور خیالات کی صداقت پر مبنی ہے۔ اگر آپ کے خیالات اور نظریات واضح ہوں تو آپ کا انداز تقریر بھی بالکل واضح اور دو ٹوک ہوگا۔

ان کے تقریر کا اپنا انداز اور طریقہ تھا۔ وہ پہلے تقریر کی روح اور اصل مواد کو مختصر سے مختصر جملوں میں بیان کر دیتے پھر تفصیل سے اس کی وضاحت کرتے۔ دورانِ وضاحت وہ ایسی زبان اور لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال سے احتراز کرتے جو مزدوروں کو سمجھ میں نہ آئیں۔ تقریر کے بعد وہ سامعین سے کہتے کہ اب وہ سوال کریں۔ اگر کوئی سوال نہیں کیا جاتا تو وہ خود جانچ پڑتال کا سلسلہ شروع کرتے۔ اسوقت ان کا انداز کچھ ایسا تدریسی ہوتا کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ پاتا۔

ایک بار جب میں نے ان کی تدریسی مہارت پر حیرت کا اظہار کیا کہ تو مجھے بتایا گیا کہ مارکس اس سے پہلے برسلز میں ورکرز سوسائٹی میں لیکچر دے چکے ہیں۔ مارکس میں تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اچھے ٹیچر میں ہونی چاہئے۔ لیکچر کے دوران وہ تختۂ سیاہ (بلیک بورڈ) کا استعمال کرتے۔ وہ اس پر فارمولے لکھ کر سمجھاتے۔ یہ فارمولے بعد میں سرمایہ میں شامل کئے گئے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ لیکچروں کا یہ سلسلہ چھ ماہ یا اس سے کم مدت تک ہی جاری رہ سکا۔ کمیونسٹ ایجوکیشنل سوسائٹی میں ایسے عناصر شامل ہوگئے جنہیں مارکس پسند نہیں کرتے تھے۔ ہجرت کرنے والے مزدوروں کی تعداد میں کمی آئی اور ان کا زور کم ہوا تو سوسائٹی تنگ نظری کا شکار ہوگئی۔ ویٹ لنگ² اور کابٹ³ کے پیروکاروں نے اپنے آپ کو تھوپنا شروع کیا۔ مارکس کو تنگ نظری یکسر پسند نہیں تھی، وہ سمجھتے تھے کہ یہاں فضول میں وقت برباد کرنے کے بجائے وہ اسی وقت میں دوسرے اہم کام کر سکتے ہیں۔

1۔ جرمن ورکرز ایجوکیشنل سوسائٹی مارکس اور اینگلز نے ۱۸۴۷ء میں برسلز میں قایم کی تھی۔ اس کا مقصد مزدوروں کو سیاسی تعلیم دینا اور سائنسی کمیونزم کے نظریات کی تشہیر تھی۔ فروری ۱۸۴۸ء میں فرانس کے بورژوا انقلاب کے فوراً بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔

2۔ ویلہلم ویٹ لنگ (۱۸۷۱-۱۸۰۸ء) مساویانہ تصوراتی کمیونزم کے نظریہ سازوں میں سے ایک۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے درزی تھے۔

3۔ اینٹی کابٹ (۱۸۵۶-۱۷۸۸ء) تصوراتی کمیونزم کے ایک نمائندہ۔ امریکہ میں تصوراتی کمیونزم کی بنیاد پر قایم کی گئی سوسائٹی کے بانی مبانی۔

زبان کے معاملہ میں مارکس بہت سخت تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ زبان کے استعمال میں غلطی نہ ہو۔ میں جس جگہ کا رہنے والا ہوں، اس خطہ کا لہجہ اور تلفظ عام جرمنوں کی لہجہ سے مختلف ہے۔ یہ لہجہ کچھ اس طرح سے مجھ سے چپک گیا تھا کہ چھڑائے نہیں چھوٹتا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے کئی مرتبہ مارکس کے لمبے لمبے لیکچر سننے پڑے۔ میں یہ سب جزئیات اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ مارکس ہم نوجوانوں کی تربیت پر کتنا دھیان دیا کرتے تھے۔

درس و تدریس کی ان کی خواہش کا اظہار دوسرے طریقوں سے بھی ہوتا تھا۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلتا کہ ہم میں سے کسی کی جانکاری اور معلومات میں کسی خاص موضوع پر کمی ہے تو وہ اصرار کرتے دباؤ ڈالتے کہ اس کمزوری کو دور کیا جائے۔ اس کو دور کرنے کے طریقے بتاتے۔ جب کوئی اکیلا، ان کے ساتھ پھنس جاتا تو اسکا اس دن امتحان لیا جاتا۔ یہ امتحان کوئی مذاق نہیں تھا۔ آپ ان کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے تھے۔ اگر انہیں یہ محسوس ہو جاتا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود بھی سامنے والا سیکھنے اور سمجھنے پر آمادہ نہیں ہے تو پھر اس سے اسی دن سے دوستی ختم ہو جاتی۔ ان سے "سبق" حاصل کرنا، ہمارے لئے باعث افتخار تھا۔ میں کبھی ان کے ساتھ نہیں رہا۔ مگر میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

اس زمانے میں بہت تھوڑی تعداد میں مزدوروں کا شعور سوشلزم کی سمجھداری تک بلند ہوا تھا۔ مزدوروں کی اس چھوٹی سی اقلیت میں بھی ایسے سوشلسٹ بہت چھوٹی تعداد میں تھے جو سوشلزم کی اس سائنسی معنی کو سمجھتے تھے جو مارکس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں بتائے ہیں۔ جو مزدور سیاسی زندگی سے دلچسپی رکھتے تھے، ان کی بھی بڑی تعداد لفظی ستیہ گرہ اور ڈرامائی انداز کی لفاظی کی دلدادہ تھی۔ ۱۸۴۸ء سے پہلے اور بعد کے زمانے کی تحریک کی یہی بنیادی خاصیت تھی۔ جذباتی نعرے مزدوروں کو پسند تھے۔ اس لئے مارکس کہتے تھے کہ اگر آپ مزدوروں میں نعروں کی بنیاد پر مقبول ہیں اور لفظی بازیگری کے ذریعہ ان سے تالیاں پٹواتے ہیں تو جان لیجئے کہ آپ غلط راہ پر ہیں مارکس اکثر دانتے کا یہ قول دہراتے تھے کہ "چیخنے چلانے والوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی راہ پر آگے بڑھتے رہو۔"

مارکس کو یہ فقرہ کتنا پسند تھا اس کا اندازہ اس سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ سرمایہ کا اختتام بھی انہوں نے اسی فقرہ سے کیا ہے۔ گھونسوں، مار پیٹ، بدگوئی اور تکلیف سے تو کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مارکس پر اکثر چاروں طرف سے حملے کئے گئے۔ انہیں اپنی بقا کے لئے ہی جدوجہد کرنی پڑی۔ اسی مزدور طبقہ نے انہیں غلط سمجھا جس کی نجات کے لئے انہوں نے دن رات کے آرام کو تیاگ دیا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ مزدوروں نے نہ صرف انہیں غلط سمجھا بلکہ ان کے دشمنوں اور طبقہ کے غداروں کو سر پر چڑھایا۔ اس وقت مارکس کو کیسی اذیت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ ایسے تمام موقعوں پر مارکس نے خود اپنی ہمت بڑھانے اور اپنی قوت کو مجتمع کرنے کے لئے نہ جانے کتنی مرتبہ

اس قول کو دوہرایا ہوگا۔
وہ کبھی اپنے مشن سے منحرف نہیں ہوئے۔ الف لیلیٰ کے ہیرو کی طرح انہوں نے خوفزدہ ہوکر منزل سے منہ نہیں موڑا۔ وہ آگے ہی آگے، اپنی منزل کی طرف بڑھتے گئے۔
انہیں شہرت سے جتنی نفرت تھی، اتنی ہی نفرت ان لوگوں سے بھی تھی جو شہرت کے بھوکے تھے۔ وہ اچھے مقررین کو پسند کرتے تھے مگر لفاظی کرنے والوں سے انہیں نفرت تھی۔ جیسے ہی انہیں پتہ لگتا کہ ان کا فلاں شناسا لفاظ ہے تو اس سے دوستی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے۔ وہ ہم "نوجوانوں" پر زور دیتے کہ ہم منطقی انداز میں سوچنے کی ضرورت کو محسوس کریں، اظہار خیال کے سادہ انداز کو اپنائیں اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔
اسی زمانے میں برٹش میوزیم کا شاندار دارالمطالعہ مکمل ہوا تھا۔ مارکس روز ہی وہاں جاتے تھے اور ہم سے بھی کہتے کہ ہم لوگ بھی اس سے استفادہ کریں۔ وہ اکثر ہمیں اس کی ہدایت کرتے اور خود اپنی عملی مثال اور لگاتار کام سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے۔
یہ وہ دور تھا جب دوسرے مہاجرین دن رات عالمی انقلاب کا خواب دیکھ رہے تھے۔ روزانہ ہی وہ اس افیم کا نشہ کرتے کہ انقلاب کل شروع ہو جائے گا اور ہم جنہیں "ڈاکو" "انسانیت کا عضو معطل اور نہ جانے کس کس نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس زمانے میں برٹش میوزیم میں مطالعہ کر کے اگلی جدوجہد کے لئے ہتھیار اور گولہ بارود تیار کر رہے تھے۔
اکثر ایسا ہوتا کہ ہمیں کھانے کے لئے ایک لقمہ بھی نصیب نہ ہوتا، اس کے باوجود ہم برٹش میوزیم میں جا کر مطالعہ کرتے۔ کم سے کم یہاں بیٹھنے کے لئے آرام دہ کرسیاں تھیں۔ سردیوں میں یہ دارالمطالعہ گرم اور آرام دہ ہوتا۔ جب کہ ہم میں سے جن کو "گھر" تھا، وہاں گھر میں ایسی سہولتیں دستیاب نہیں تھیں۔ مارکس بڑے سخت گیر ٹیچر تھے۔ وہ نہ صرف ہمیں پڑھنے پر مجبور کرتے بلکہ یہ بھی دیکھتے کہ ہم فی الواقعی پڑھ رہے ہیں۔
ایک طویل عرصہ تک میں برطانیہ کی ٹریڈ یونین تاریخ کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس دوران وہ روز ہی پوچھتے کہ میں کہاں تک پہنچا ہوں۔ انہوں نے مجھے اسی وقت چین کا سانس لینے دیا جب میں نے کافی بڑی تعداد میں سامعین کے سامنے اس موضوع پر ایک اچھی خاصی تقریر کی۔ وہ اس تقریر کے دوران موجود تھے۔ انہوں نے نہ تو میری تقریر کی تعریف کی اور نہ ہی اس پر کوئی تنقید کی۔ انہیں کسی کی تعریف کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اکثر وہ ایسا اسی وقت کرتے جب کسی سے ہمدردی جتانا ہو۔ اس لئے میں نے تنقید نہ ہونے پر ہی دل کو دلاسہ دیا۔ بعد میں دن جب انہوں نے میری تقریر کے ایک نکتہ پر مجھ سے بحث کی تو مجھے احساس ہوا کہ انہیں میری باقی تقریر پسند آئی تھی۔

ٹیچر کی حیثیت سے مارکس بہت سخت تنقید کیا کرتے تھے مگر وہ اس بات کا دھیان رکھتے تھے کہ تنقید سے سامنے والے کا حوصلہ نہ ٹوٹے۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیں سکھاتے کہ کس طرح خود اپنا محاسبہ کرنا چاہئے۔ وہ ہمیں بتاتے کہ اپنی کامیابیوں پر لاپرواہ ہو کر بیٹھ نہیں جانا چاہئے وہ اس معاملے میں بھی بہت ہی سختی سے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔

(۴)

مارکس کا اسٹائل

ممتاز فرانسیسی مصنف نے کہا ہے کہ انسان اپنے اسٹائل (انداز) سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ بات کسی اور کے لئے درست ہو یا نہ ہو مگر مارکس پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ مارکس سچائی کے زبردست دلدادہ تھے۔ ان کے لئے سچائی ہی سب سے اہم تھی۔ ان کے لئے سچائی کے سوا اور کوئی چیز بامعنی نہیں تھی۔ انسان کو اپنی کھوج بہت عزیز ہوتی ہے۔ لیکن مارکس ایسے تھے کہ اگر انہوں نے ایک لمحہ پہلے کوئی کھوج کی ہو، اور دوسرے ہی لمحے انہیں پتہ چلا کہ یہ درست نہیں ہے تو اسے بلا کسی ہچکچاہٹ کے رد کر دیتے تھے۔ سچائی سے اسی اتھاہ وابستگی کی وجہ سے مارکس اپنی تحریروں میں بھی ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے وہ حقیقی زندگی میں تھے۔ مارکس جیسی ہمہ جہت اور رنگارنگ شخصیت کا اسٹائل ہمیشہ ایک جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ سرمایہ کے مارکس '۱۸ ویں برومائیر کے مارکس اور دیگر تصنیفات کے مارکس' اپنے اسٹائل اور انداز تحریر کے لحاظ سے مختلف نظر آتے ہیں مگر ان میں خیالات کا تسلسل ہے۔ ان میں نظریات کی یگانگت ہے جو مارکس کا خاصہ ہے۔ اندازِ تحریر اور اسٹائل کی مختلف نوعیت کے باوجود ہر جگہ ایک ہی مارکس چھائے ہوئے ہیں۔ جو اصلی زندگی کے مارکس ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ سرمایہ کا انداز تحریر بہت مشکل ہے مگر پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا سرمایہ میں جس موضوع سے بحث کی گئی ہے کیا وہ آسان ہے؟ انداز تحریر محض مصنف کا آئینہ دار نہیں ہوتا بلکہ اس کی مطابقت موضوع سے بھی ہوتی ہے۔ علم کے حصول کے لئے کوئی صراطِ مستقیم نہیں ہے' اس کے لئے دشوار گذار راستوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا الیڈر کیوں نہ ہو، علم بغیر مشقت کے حاصل نہیں ہوتا۔ سرمایہ کے کٹھن انداز تحریر یا بوجھل پن کی شکایت کرنے والا دراصل اپنے ذہنی تساہل اور فکر و خیال کی صلاحیت کے فقدان کا اظہار کرتا ہے۔

کیا ۱۸ ویں برومائیر ناقابل فہم ہے؟ کیا وہ تیر ناقابلِ فہم ہے جو سیدھا نشانہ پر جا کر لگتا ہے۔

اور اس میں دھنس جاتا ہے؟ کیا وہ بھالا ناقابلِ فہم ہے جو مشاق ہاتھوں سے نکل کر سیدھے دشمن کے سینے میں لگتا ہے؟ اگر نفرت کا غصہ اور آزادی کے لئے محبت کے جذبات کا کہیں شعلہ نوا انداز اور متاثر کن لفظوں میں اظہار ہوا ہے تو وہ ۱۸ ۔ ویں برومائیر ہے۔ اس میں مشہور رومن مورخ ٹاکٹس کی گہرائی اور مزاح نگار جونال کا تیکھاپن ہے۔ یہاں مارکس کا اندازِ تحریر راست دل کو لگنے والا ہے کیونکہ اس کا موضوع ایسے ہی اندازِ تحریر کا متقاضی تھا۔ یہاں اندازِ تحریر وہ ہتھیار ہے جو سیدھے دل کو لگتا ہے۔

ہیر وگت میں، ان کا اندازِ تحریر شکسپیر کا اندازِ شگفتگی لئے ہوئے ہے۔

مارکس کا اسٹائل، دراصل مکمل مارکس ہے۔ مارکس پر اس بات کے لئے تنقید کی گئی ہے کہ اندازِ تحریر کچھ پیش کرنے جیسا ہے وہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ مواد سمونا چاہتے ہیں۔ دراصل یہی تو مارکس اور ان کی خوبی ہے۔

مارکس اظہارِ بیان کی مکمل درستگی کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے گوئٹے، لیسنگ، شکسپیر، دانتے اور سروانتس جیسے چوٹی کے فنکاروں کو اپنا رہبر بنایا تھا جن کی تخلیقات کا تقریباً وہ روزانہ ہی مطالعہ کرتے تھے۔ جہاں تک زبان و بیان کی درستگی کا تعلق ہے، وہ بہت ہی محتاط تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ میں نے ایک ایسی جرمن اصطلاح استعمال کی جو عام طور سے مستعمل نہیں تھی۔ اس پر مجھے مارکس کی زبردست پھٹکار سننی پڑی۔ میں نے اپنے حق میں بہت سے دلائل دیئے مگر مارکس نہیں مانے، انہوں نے اپنی دلیلوں سے مجھے قائل کر دیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ پھر کبھی میں نے خود تو وہ اصطلاح استعمال نہیں کی دوسروں کو بھی اس کے استعمال سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

میں نے بتایا کہ مارکس اصطلاحات کے تعلق سے بہت سخت گیر تھے۔ کبھی کبھی وہ ایک صحیح اصطلاح کی تلاش میں کافی وقت صرف کر دیتے۔ وہ تحریر میں غیر مانوس اور غیر ضروری طور پر دوسری زبانوں کے الفاظ کے استعمال سے نفرت کرتے تھے۔ اگر انکی اپنی تحریریں اگر دوسری زبان کی اصطلاحات ملتی ہیں تو اس کی بڑی وجہ ان کا بدیسوں میں اور بالخصوص انگلینڈ میں طویل مدت تک قیام ہے۔ وہ کافی عرصہ جرمنی سے باہر رہے ان کی دو تہائی زندگی جرمنی سے باہر گذری، اس کے باوجود ان کی جرمن تحریریں اصل جرمن اصطلاحات سے اٹی پڑی ہیں۔ وہ جرمنی کے ادب کے ممتاز خالقوں اور فنکاروں میں سے ایک ہیں۔

(۵)

مارکس، سیاستداں، عالم اور انسان

مارکس سیاست کو بھی سائنس سمجھتے تھے۔ وہ اعلیٰ طبقوں کی سیاست سے نفرت کرتے تھے۔

کیا اس سے بھی زیادہ بے معنی کوئی اور چیز ہو سکتی ہے؟

تاریخ، انسان اور قدرت میں سرگرم تمام قوتوں، انسانی فکر، انسانی جذبات اور انسانی ضروریات کی پیداوار ہے۔ جب کہ سیاست نظریہ کی حد تک، ان لاکھوں کروڑوں عوامل کا علم ہو۔ جو وقت کے چرخہ پر کاتے جا رہے ہیں۔" اور عمل کی دنیا میں اس علم کی بنیاد پر سرگرمی کا نام ہے۔ اسی لئے سیاست ایک سائنس ہے۔ اپلائیڈ سائنس۔

مارکس کا غصہ اس وقت قابل دید ہوتا جب وہ ان خالی الذہن لوگوں پر برس رہے ہوتے جو سمجھتے تھے کہ وہ چند سکہ بند محاوروں کی مدد سے چیزوں کی توضیح کر سکتے ہیں اور سرکاری دفتروں، اخبارات، عوامی جلسوں یا پارلیمنٹ کی مدد سے دنیا کے مقدر کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی خواہشات اور پسند کو حقائق بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ایسے "خالی دماغ" لوگوں کو بہت "عظیم انسان اور مدبر" مانا جاتا تھا۔

اس نکتہ پر مارکس نے نہ صرف ایسے لوگوں کی نکتہ چینی کی بلکہ عملی طور پر مثال بھی پیش کی۔ فرانس کے عصری واقعات نپولین کی بغاوت پر مضامین اور نیو یارک ڈیلی ٹریبون کے لئے اپنے خبرناموں میں مارکس نے سیاسی تاریخ نویسی کے کلاسیکل انداز کا نمونہ پیش کیا ہے۔

یہاں میں ایک تقابلی جائزہ پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نپولین کی بغاوت کا مارکس نے ۱۸ ویں برومائر میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس موضوع پر عظیم فرانسیسی رومانی ناول نگار وکٹر ہیگو نے بھی طبع آزمائی کی۔ وکٹر ہیگو اپنے دلکش انداز تحریر اور محاوراتی زبان کیلئے بہت مشہور ہیں اس کتاب سے انہیں خوب شہرت ملی مگر ان دونوں کتابوں کا تضاد بالکل واضح ہے ناول میں حقائق سے کوئی واسطہ نہیں ہے، وہ لفاظی کا مرقع ہے، جب کہ مارکس نے ایک منصوبہ بند انداز میں حقائق پیش کئے ہیں، حقائق کا ایک سائنس داں کی حیثیت سے تجزیہ کیا ہے، ایک بیباک سیاستداں کی طرح انہیں تولا ہے، مگر سیاستداں کی بیباکی، نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

ناول، انداز بیان کی دلکشی، لفاظی اور خیالی کرداروں سے مرقع ہے۔ جبکہ مارکس کی تحریر سخت الزامات پر مبنی ہے، ہر الزام کے حق میں ٹھوس دلائل پیش کئے گئے ہیں، دو ٹوک اور واضح لفظوں میں بات کہی گئی ہے، حقیقت پوری طرح سے بے نقاب کر دی گئی ہے، وکٹر ہیگو کے ناول نپولین لے پیتیت کے یکے بعد دیگرے دس ایڈیشن شائع ہوئے مگر آج انہیں کوئی بھی نہیں جانتا جب کہ مارکس کی ۱۸ ویں برومائر کو آنے والے ہزاروں برسوں تک عقیدت کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مارکس وہی ہے جو انگلینڈ کے حالات میں انہیں بننا چاہئے تھا موجودہ صدی کے وسط تک، معاشی لحاظ سے جرمنی جتنا پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ تھا، اس میں مارکس کے لئے بورژوا اقتصادیات کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا اور اس کے پیداواری عمل کا تجزیہ اتنا ہی ناممکن تھا

جتنا پسماندہ جرمنی کے لئے اقتصادی طور پر ترقی یافتہ انگلینڈ کے سیاسی اداروں کا اپنانا—
مارکس بھی اپنے گرد وپیش کے واقعات حالات سے اسی طرح متاثر ہوئے جیسے کسی آدمی کو ہونا چاہئے۔ ان حالات کے بغیر، وہ ویسے بن ہی نہیں سکتے تھے جیسے وہ بنے۔ اس بات کو مارکس نے جتنے اچھے ڈھنگ سے ثابت کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔

ایسے متاثر کن حالات سے دوچار ہونا اور سماج کی نوعیت پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے واقعات کا جائزہ بے کراں کا تجزیہ کرنا بذات خود ایک ذہنی تفریح تھی۔ مجھ جیسے ناتجربہ کار علم کے متلاشی نوجوان کو مارکس جیسا اتالیق اور رہنما ملنا، ایک ایسی خوش بختی ہے، جس کی اہمیت اور افادیت کا مکمل اندازہ میں خود بھی ساری عمر نہیں کر سکوں گا۔ ان کے اثرات اور تعلیم سے مجھے جو فائدہ ہے، وہ بے کراں ہے۔

ان کے ذہن کی ہمہ جہتی کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا ذہن دنیا کے ہر عمل کا بغور جائزہ لیتا تھا، وہ کسی بھی چیز کو ثانوی اور غیر اہم نہیں سمجھتے تھے، ہر مشاہدہ کی معمولی سی تفصیل کی بھی جانکاری حاصل کرتے تھے، اس لئے ان کی تعلیمات، یک طرفہ نہیں ہو سکیں۔ وہ ہمہ جہت ہیں۔

مارکس وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ڈارون کی تحقیق کو سمجھا، انہوں نے ۱۸۵۹ء سے جس سال انسان کے ارتقاء کے متعلق کتاب شائع ہوئی اور اتفاق سے اسی سال مارکس کی کتاب سیاسی معاشیات کا تنقیدی جائزہ بھی شائع ہوئی، سے پہلے ہی مارکس نے ڈارون کی زمانہ ساز تحقیق کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ جس وقت ڈارون شہر کی ہماہمی سے دور، اپنی رہائش گاہ پر ایک انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے، اسی وقت مارکس خود، دنیا کی سرگرمیوں کے مرکز میں بیٹھے ہوئے ایک ایسے انقلاب کے لئے کام کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دونوں کا موضوع الگ الگ تھا مگر تحقیق کی نوعیت تقریباً ایک جیسی تھی۔

مارکس علم کی تمام شاخوں میں ہونے والی ہر پیش رفت پر نظر رکھتے تھے۔ وہ کیمسٹری فزکس سمیت سائنسی تحقیقات پر بالخصوص توجہ دیتے تھے۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ مالسخوت، لائی اور رکسلے[1]

مالسخوت جیکب (۱۸۹۳ - ۱۸۲۲ء) ڈچ لینڈ میں جنم لینے والے فزیولوجسٹ، نیم پختہ مادیت پسند، لائی بگ جے (۱۸۷۳ - ۱۸۰۳ء) ممتاز جرمن سائنسداں، زرعی علم کیمیا کے بانیوں میں سے ایک، تھامس ہنری ہکسلے (۱۸۹۵ - ۱۸۲۵ء) انگریز سائنسداں، ڈراون کے قریبی ساتھی اور ان کے نظریات کے مبلغ

کے نام ہماری محفلوں میں ایسے ہی لئے جاتے تھے جیسے رکارڈر، آدم اسمتھ، مک کولوچ اور دوسرے اسکاٹ لینڈ اور اٹلی کے ماہرین معاشیات کے۔ ہم ان سائنسدانوں کے "عام فائیدے کے لئے کئے جانے والے" لیکچروں میں باالتزام شریک ہوا کرتے تھے۔ جب ڈارون نے اپنی تحقیقات کے تاریخی نتائج دنیا کے سامنے پیش کئے تو مہینوں تک ہم ڈارون کی عظیم تحقیقات اور ان کی اہمیت پر ہی بات کرتے رہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی موضوع تھا ہی نہیں۔

مارکس نے جس طرح اور جس انداز سے دوسروں کی تحقیقات اور کاوشوں کی ستائش کی ہے اور ان محققین کو ان کا جائز مقام دیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ کسی سے حسد کرنے یا جلنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مارکس ان سب سے بہت اوپر تھے۔ وہ اس معاملہ میں واقعی عظیم تھے۔ مگر عظمت کا دکھاوا کرنے، جھوٹی شہرت پر اترانے اور نا اہل لوگوں کے قابلیت جتانے کی عادت سے وہ اتنے ہی چڑتے تھے جیسے کہ کسی دھوکے باز سے۔

میں آج تک جتنے بڑے، چھوٹے اور عام لوگوں سے ملا ہوں، ان میں سے چند ایسے تھے، جن میں مارکس بھی شامل ہیں، جنھیں میں نے تصنع سے مبرا پایا۔ تصنع اور بناوٹ سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کی نقل نہیں کی۔ وہ خود ایک مثال تھے۔ وہ جھوٹی نقاب اوڑھنے یا دکھاوا کرنے کے معاملہ میں اتنے ہی نا اہل تھے جیسا کہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہوگا۔ جب تک کسی سماجی یا سیاسی ضرورت نے انہیں پابند نہ کر دیا ہو۔ انہوں نے ہمیشہ کھلے دل اور دماغ سے بات کی۔ ان کا چہرہ ان کے دل کا آئینہ تھا۔ جب کبھی ضرورت کی وجہ انہیں بات میں احتیاط برتنی پڑتی ان کے چہرہ پر ایسے حالات میں بچوں جیسے تاثرات ہوتے جس سے اکثر ان کے دوست لطف اندوز ہوتے تھے۔

مارکس سا سچا اور راست گو آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سچائی کے اوتار تھے۔ صرف ان پر ایک نظر ڈال کر ہی آپ اندازہ کر سکتے تھے کہ آپ کیسے آدمی سے دوچار ہیں۔ ہمارے "مہذب" سماج میں، جو ہمیشہ حالتِ جنگ میں ہے، ہمیشہ سچ بولنا ممکن ہی نہیں ہے، اگر آپ نے ایسا کیا تو خطرہ ہے کہ آپ دشمن کے ہاتھ میں کھیل جائیں گے یا پھر جیل خانے کی سیر کرنی پڑے گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات درست ہو کہ ہر وقت سچ نہیں بولا جا سکتا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ ایسے موقعوں پر

نمبر ۱- ڈیوڈ رکارڈو (۱۷۷۲-۱۸۲۳ء) اور آدم اسمتھ (۱۷۲۳-۱۷۹۰ء) انگریز ماہر معاشیات، جو کلاسیکی بورژوا سیاسی معاشیات کے عظیم نمائندے تھے۔ مک کولوچ (۱۷۸۹-۱۸۶۴ء) انگریز بورژوا ماہر معاشیات ... جدید بورژوا رجحان کا نمائندہ تھا۔

جھوٹ بولنا بھی ضروری نہیں ہے۔ میرے لئے ضروری نہیں ہے کہ میں ہر موقعہ پر وہی کہوں جو میں سمجھتا اور محسوس کرتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی غلط ہے کہ میں خلاف واقع بات کہہ کر چاپلوسی کروں۔ یہ مکاری ہوگی۔ مارکس نے کبھی ایسی مکاری نہیں کی۔ وہ کسی بچے کی طرح، اس کے نااہل تھے۔ ان کی بیوی اکثر انہیں "میری بڑی بچی" کہہ کر پکارتی تھیں۔ مارکس کو جتنا ان کی بیوی سمجھتی تھی، اتنا کسی اور نے، حتیٰ کہ اینگلز نے بھی نہیں سمجھا۔ سچائی تو یہ ہے کہ وہ جب اس سماج میں تھے، جہاں پر ہر چیز کو محض دکھاوے پر پرکھا جاتا ہے اور جہاں اپنے احساسات کو دبانا اور چھپانا مہارت مانی جاتی ہے، ہمارے "مور" ایک بڑے بچے کی مانند ننھے جنھیں بیوقوف بنایا جا سکتا تھا اور جو بچوں کی طرح ہی کلکاریاں بھرتے تھے۔

وہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو ان کے سامنے اداکاری کریں۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے لوئی بلانک[1] سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے کیسے قہقہے لگائے تھے۔ لوئی بلانک جب پہلی مرتبہ ملنے آیا تو مارکس ڈین اسٹریٹ والے گھر میں ہی مقیم تھے۔ اس گھر میں دو کمرے تھے۔ جس میں سے سامنے کا کمرہ ریسپشن اور اسٹڈی کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور پچھلا کمرہ، ہر مقصد کے لئے۔ لوئی بلانک نے لینچن کو اپنا کارڈ دیا تو اس نے انہیں سامنے کا کمرہ بنا دیا۔ اس وقت مارکس پچھلے کمرے میں تیزی سے کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ دروازے کی جھری سے مارکس نے ایک دلچسپ منظر دیکھا۔ یہ عظیم "مورخ" اور سیاستداں انتہائی پستہ قد تھا۔ اس کا قد مشکل سے آٹھ برس کے بچے کے قد کے برابر ہوگا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے بغور کمرے کا جائزہ لیا۔ اچانک اس کی نظر ایک پرانے آئینہ پر پڑی۔ وہ فوراً اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ اپنے بدن کو سیدھا کیا۔ آئینہ کے سامنے پوری طرح تن کر کھڑے ہونے کے بعد، اس نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں پوز بنایا۔ وہ ایک بہت ہی اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ ایسے اونچے جوتے میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ آئینہ کے سامنے وہ ایسی حرکت کر رہا تھا جیسے کوئی جنگلی خرگوش کودنے کے موڈ میں ہو۔ اس نے اپنے آپ کو سنوارا اور متاثر کن نظر آنے کی کوشش کی۔ مارکس کی بیوی بھی "یہ نظارہ" کر رہی تھیں۔ انہیں اپنی ہنسی روکنے کے لئے ہونٹ چبانے پڑے۔ مارکس نے جب کپڑے تبدیل کر لئے تو وہ زور سے کھنکارے تاکہ مہمان کو ان کی آمد کا اندازہ ہو جائے۔ مارکس نے کچھ توقف کیا تاکہ مہمان آئینہ کے سامنے سے ہٹ کر میزبان کا سواگت کرنے کے موقف میں آجائے۔ "ننھے لوئیس" (پیرس کے مزدور لوئیس بونا پارٹ

---

[1] لوئی بلانک (۱۸۸۲-۱۸۱۱ء) فرانس کا پتی بورژوا سوشلسٹ جو ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے دوران عارضی سرکار کا رکن تھا۔ وہ بورژوازی سے صلح کی پالیسی کا پرچارک تھا۔

کے قد کے تضاد میں اسے اسی نام سے پکارتے تھے) نے بہت اداکاری کی، مگر مارکس کے سامنے یہ سب کچھ چلا نہیں اور اسے جلد ہی اپنا فطری رویہ اپنانا پڑا۔ حالانکہ اس میں اسے بڑی دقت ہوئی۔

(۶)

مارکس کام کرتے ہوئے

"ذہانت صنعت ہے" کسی کا یہ مقولہ اگر پوری طرح سے نہیں تو کسی حد تک ضرور درست ہے۔ غیر معمولی لگن، محنت اور انرجی کے صرفہ کے بغیر ذہانت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اگر کسی کو ذہین کہا جائے اور اس میں یہ خصوصیات نہ ہوں تو اس کی وقعت پانی کے بلبلے یا کنگال بنک سے زیادہ نہیں ہے۔ ذہین شخص وہ ہے، جس نے عام آدمی سے زیادہ لگن اور محنت سے کام کیا ہو۔ میں ایسے بہت سے لوگوں سے ملا ہوں جو خود کو ذہین سمجھتے تھے اور جن کے بارے میں لوگوں کو بھی مغالطہ تھا مگر جن میں کام کرنے کی اہلیت نہیں تھی۔ دراصل وہ ایسے شعبدے تھے جن میں موقعہ کی نزاکت کو سمجھنے اور اپنی پبلسٹی کروانے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ میں نے جتنے بھی حقیقی معنوں میں اہم اور بڑے لوگوں سے ملاقات کی ہے وہ سب سخت محنت اور پر لگن کام کے عادی تھے۔ مارکس اس کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ پہلی جلاوطنی کے دنوں میں یہ عام بات تھی۔ ایسی حالت میں وہ راتوں میں کام کرنے لگے تھے۔ جب کبھی وہ کسی میٹنگ یا ملاقات سے مل کر رات دیر سے گھر لوٹتے تھے تو یہ ان کی عادت تھی کہ رات چند گھنٹے ضرور کام کرتے۔ پھر یہ "چند" گھنٹے بتدریج بڑھتے گئے اور حالت یہ ہوئی کہ وہ اکثر رات رات بھر کام کرتے اور صبح ہوتے ہوتے بستر پر پہنچتے۔ اکثر ان کی بیوی، پورے خلوص سے انہیں اس کے لئے ڈانٹتیں مگر وہ جواب میں ہمیشہ ایک قہقہہ لگاتے۔ یہ ان کی فطرت تھی۔

مارکس ویسے بڑے فربہ جسم کے مالک تھے مگر عمر کی پانچویں دہائی کے خاتمہ تک، وہ مختلف بیماریوں سے دوچار ہو گئے تھے۔ جب ڈاکٹر سے مشورہ کیا گیا تو اس نے رات میں کام کرنے پر سخت پابندی لگادی۔ ان کے لئے کئی کسرتوں ۔ گھو [illegible] اور چہل قدمی ــــ کا نسخہ تجویز ہوا۔ اس دور میں، اکثر چہل قدمی کے دوران، میں ان کے ساتھ رہا۔ وہ عام طور سے لندن کے مضافات، بالخصوص شمالی پہاڑی علاقوں میں چہل قدمی کیلئے جاتے۔ جلد ہی ان کی صحت اچھی ہو گئی۔ ان کا جسم دراصل سخت محنت کا عادی ہو چکا تھا۔

ابھی وہ پوری طرح سے صحت یاب بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے پھر بتدریج رات میں کام کے گھنٹوں کو بڑھانا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ شدید بحران تھا جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ کسی حد تک اپنے طریقۂ کار کو بدلیں۔ مگر اس تبدیلی پر بھی وہ صرف اسی وقت تک قائم رہے جب تک

انہیں لگا کہ یہ ناگزیر ہے۔

ان کی بیماری شدت اختیار کرنے لگی۔ ایک گردہ خراب ہو گیا۔ رسولی بن گئی۔ ان کا آہنی جسم دھیرے دھیرے ڈھلنے لگا۔ مجھے یقین ہے اور آخری دنوں میں ان کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے کہ اگر مارکس نے قدرت کے اصولوں کی تابعداری کرتے ہوئے زندگی گذاری ہوتی اور اپنے جسم کے تقاضوں کو پورا کیا ہوتا تو وہ آج ہمارے درمیان زندہ موجود ہوتے۔

عمر کے آخری دنوں میں جب بہت دیر ہو چکی تھی، مارکس نے رات میں کام کرنے کی عادت ترک کی، مگر وہ دن میں زیادہ کام کرنے لگے۔ جب بھی موقعہ ملتا وہ کام میں جٹ جاتے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ جب چہل قدمی کے لئے جاتے تو ان کی نوٹ بک ساتھ ہوتی اور وہ اس میں کچھ نہ کچھ نوٹ کرتے جاتے۔ وہ کوئی سطحی کام نہیں کرتے تھے۔ ان کا کام ان کی تحقیقات گہرائی لئے ہوئے ہوتیں۔ ان کی بیٹی الیانور نے مجھے تاریخ کے موضوع پر ایک چارٹ دکھایا تھا جو انہوں نے بعض ثانوی اطلاعات کے متعلق عام معلومات کی غرض سے تیار کیا تھا۔ اس میں کوئی بھی چیز ثانوی معلومات کے زمرے میں نہیں آسکتی۔ حالانکہ یہ چارٹ مارکس نے اپنے نجی استعمال کے لئے تیار کیا تھا مگر وہ اس حد تک مکمل تھا جیسے اسے اشاعت کے لئے تیار کیا گیا ہو۔

مارکس جس دلجمعی سے کام کرتے تھے، اس پر اکثر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ کاہلی اور تساہل سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ جب بیماری نے انہیں بالکل لاغر کر دیا تھا، اس وقت بھی انہوں نے کام کے تعلق سے کسی نقاہت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

جس طرح کسی چیز کی قدر کا تعین، اس میں مشمولہ محنت سے کیا جاتا ہے، اس طرح اگر آدمی کی قدر کا تعین اس کے کئے ہوئے کام سے کیا جائے تو بھی مارکس کی قدر اتنی تھی کہ دنیا میں چند ہی ایسے ذہین ہوں گے جنہیں ان کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس بورژوا سماج نے مارکس کے اس زبردست اور عظیم کام کا کیا معاوضہ دیا؟

سرمایہ پر مارکس نے چالیس برس صرف کیا اور اس پر انہوں نے جتنی محنت کی وہ مارکس کا ہی حصہ تھا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ جرمنی میں سب سے کم روزانہ اجرت پانے والے مزدور کو چالیس برسوں میں جتنا معاوضہ ملا ہوگا، مارکس کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔ اس صدی کی دو عظیم تحقیقات کی جتنی بے قدری ہوئی 'دمنڈی کی قدر کے لحاظ سے'، وہ اپنی جگہ مثال ہے۔ مارکس کے علاوہ دوسرا عظیم محقق، ڈارون تھا۔

"علم منڈی کی جنس" نہیں ہے۔ بورژوا سماج سے یہ امید کبھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی ہی موت کے پروانہ کی قیمت ادا کرے۔

(۷)

ڈین اسٹریٹ کے مکان میں

۱۸۵۰ء کے گرما سے ۱۸۶۲ء کی ابتدا میں جرمنی لوٹنے کے وقت تک میں باقاعدگی سے ہر روز مارکس کے گھر جاتا رہا۔ کئی برسوں تک تو سارا دن ہی ان کے گھر پر رہتا تھا۔ میں ان کے گھر کا ایک فرد سا بن گیا تھا۔

میت لینڈ پارک روڈ کے کاٹج میں منتقل ہونے سے پہلے مارکس ڈین اسٹریٹ، سوہو اسکوائر کے ایک عام سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اس علاقہ میں زیادہ تر مسافر، مہاجرین رہتے تھے۔ اس علاقہ میں ہر قسم اور ہر سطح کے لوگ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ ان کامریڈز کے لئے ملاقات کی آماجگاہ بھی تھا جن کی مستقل رہائش لندن میں تھی۔ لندن میں مستقل رہائش حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ بھوک نے بہت سے مہاجرین کو دیہی علاقوں، حتیٰ کہ امریکہ تک کا رخ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ حالت اتنی خراب تھی کہ خستہ حال مہاجرین کو لندن کی ایک قبرستان کا رخ کرنا پڑتا تھا، جہاں رہنے کی جگہ تو نہیں تھی مگر رات گذاری جاسکتی تھی۔ لیسنر اور لوخنر[۱] کے علاوہ شاید میں اکیلا مہاجر تھا جس نے کسی نہ کسی طرح اپنی رہائش کا انتظام کرلیا تھا۔ وہ دونوں تو ڈین اسٹریٹ بہت کم آتے تھے مگر میں جلاوطنی کی پوری مدت کے دوران (ایک مختصر سے وقفہ کے سوا، جس کا بعد میں تذکرہ کروں گا) "مور" کے گھر، ان کے اہل خاندان ہی کی طرح باقاعدگی سے جاتا تھا۔ اس لئے میں نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جس کا دوسروں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۸)

مہاجرین کی چالبازی

میرے لندن جانے سے پہلے کے میرے دوست اور میرے ساتھی، مارکس سے میری وابستگی کی

۱؎ فریڈرک لیسنر (۱۸۲۵ء-۱۹۱۰) مزدور طبقہ کی بین الاقوامی تحریک کی ممتاز شخصیت، پیشہ کے لحاظ سے درزی، مارکس اور اینگلز کے رفیق اور معاون۔
جارج لوخنر۔ (پیدائش ۱۸۲۴ء) جرمن کے مزدور طبقہ کی تحریک کے سرگرم کارکن، کمیونسٹ لیگ اور پہلی انٹرنیشنل کے رکن، پیشہ سے بڑھئی، مارکس اور اینگلز کے حمایتی۔

وجہ سے میرا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ حال ہی میں، مجھے ایک اہم بیدن رضاکار، بیوؔر کا، اسی مدت میں سنشم سے لکھا خط میرے فائیلوں میں ملا۔ حال ہی میں ان کا مل وائیوکی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ جہاں سے، انہوں نے ایک ریڈیکل جمہوری اخبار نکالا تھا اور خود ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ صاحبِ وسائل دوسرے مہاجرین کی طرح وہ بھی کچھ عرصہ لندن میں رہنے کے بعد امریکہ چلے گئے تھے اور وہاں اپنی پسند کا کام تلاش کر لیا تھا۔

یہ زمانہ لندن میں مہاجرین کے لئے بہت مشکلات کا تھا۔ بیور چاہتے تھے کہ میں بھی ان کیساتھ امریکہ چلا چلوں۔ امریکہ پہنچنے کے بعد انہوں نے مجھے کئی خطوط لکھے اور کہا کہ بحیثیت ایڈیٹر مجھے اچھی خاصی تنخواہ ملے گی۔ اس زمانہ میں میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ مجھے ایک ہفتہ کے لئے، ۵ ڈالر ہفتہ کی پیشکش کی جارہی تھی۔ یہ کافی پرکشش اور دلفریب چارہ تھا۔ میں نے اس لالچ کی مزاحمت کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اصل میدان جنگ سے دور رجاؤں۔ میں اس سے ممکنہ حد تک قریب رہنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو بھی سمندر پار گیا، تو پھر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ یورپ میں گم ہوگیا۔

بیور نے آخر میں اپنا آخری ہتھیار استعمال کیا۔ انہوں نے میری خودی کو للکارا۔ ان کا وہ خطاب تک میرے فائیل میں موجود ہے۔ انہوں نے لکھا تھا: "یہاں تم ایک آزاد شخص ہوگے اور آزادانہ طور پر بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو۔ وہاں آخر تم کیا کر رہے ہو؟ آخر تمہاری آسمانی شہنشاہیت میں تمہاری حیثیت کیا ہے؟ بوجھ لادنے والے ایک گدھے سے زیادہ تمہاری کوئی حیثیت نہیں جب کام کے بعد کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ وہاں سب سے اوپر، ہمہ داں، سب سے زیادہ عقل مند، دلائی لامہ، مارکس ہے۔ اس کے بعد بہت سے بڑا خلاء۔ پھر اینگلز کا نمبر آتا ہے۔ پھر اس سے بھی بڑا خلا، پھر کہیں وولف کا نمبر ہے۔ اس کے بعد پھر خلاء ہی خلاء۔ پھر شاید کہیں اس "جذباتی گدھے" کا نمبر آتا ہوگا جسے لیبنیخت کہتے ہیں۔"

میں نے انہیں جواب بھیجا۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ مجھ سے پہلے ان لوگوں کا نمبر آئے جنھوں نے مجھ سے زیادہ کام کیا ہے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہوں جن سے میں کچھ سیکھ سکوں۔ جن کو دیکھنے کے لئے مجھے اوپر دیکھنا پڑے مجھے ایسے لوگوں کا ساتھ پسند نہیں جنہیں دیکھنے کے لئے مجھے نیچے دیکھنا پڑے جن کے درمیان مجھے "عظیم انسان" سمجھا جائے۔

اس لئے میں جہاں تھا، وہیں رہا اور بہت کچھ سیکھا۔

مگر یہی وہ رائے ہے جو ہمارے دائرہ سے باہر کے مہاجرین مارکس اور ہمارے معاشرہ کے بارے میں رکھتے تھے۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ ہم نے کیسے خود کو ان سے بالکل الگ تھلگ

۲ے کارل فریڈرک بیور۔ انہوں نے بیدن۔ یار کی ۱۸۴۹ء کی بغاوت میں حصہ لیا تھا۔

کرلیا ہے۔ اس کے لئے وہ ہمارے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرتے اور افواہیں پھیلاتے۔ مگر ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

(۹)

مارکس کے گھر پر ملاقاتیں

مجھ پر شاید مارکس کی بیوی کا بھی اتنا ہی اثر ہے جتنا مارکس کا۔ میری ماں کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا، جب میں تین سال کا تھا۔ میری پرورش انتہائی مشکل حالات میں ہوئی تھی۔۔۔۔ مارکس کی بیوی میں، مجھے وہ خوبصورت، ذہین اور شریف الذہن خاتون مل گئی تھی جو مجھ جیسے بے سہارا، تنہا رضاکار باغی مہاجر کے لئے نصف ماں اور نصف بہن تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ مارکس خاندان تھا، جس نے جلاوطنی کے مشکل دنوں میں مجھے تباہی سے بچا لیا۔ مارکس کے گھر پر میرے جتنے لوگوں سے ملاقات ہوئی، اس کا اپنے گھر میں، اپنے اکیلے کی بساط پر میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مارکس کے گھر پر جرمنی سے آئے لاتعداد جلاوطنوں سے، جن سے ہماری کوئی نظریاتی مخاصمت نہیں تھی، میں نے برطانیہ کی مزدور تحریک کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ ان میں ہی جولین ہارنے تھے، بیباک اور نڈر صحافی ارنیسٹ جون تھے۔ یہ دونوں اس چارٹسٹ تحریک کے نمائندے تھے جو برطانیہ کی پہلی عوامی انقلابی تحریک (۴۰-۱۸۳۰ء) تھی اور جو بعد میں سوشلسٹ تحریک کی بنیاد بنی۔ ان میں ہی فراسٹ تھے جو چارٹسٹ بغاوت کے ممتاز رہنما تھے۔ اس کی وجہ سے انہیں عمر بھر کے لئے ملک بدر کردیا گیا تھا مگر چھٹی دہائی میں انہیں معافی ملی اور وہ انگلینڈ آگئے تھے۔ وہ چارٹسٹ تحریک میں بائیں بازو کے اس رجحان کے نمائندے تھے جو "پرامن جدوجہد" کے مقابلے میں "پرتشدد جدوجہد" کے قائل تھے۔ میری ملاقات سائنسی سوشلزم کے سب سے بڑے بزرگ اور سب سے زیادہ واضح سمجھ داری (مارکس سے قبل کے دور میں) کے حامل رہنما رابرٹ اون سے بھی، مارکس کے ہی گھر پر ہوئی۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ ہم نے ان کی ۸۰ ویں سالگرہ کی تقریب میں شرکت کی میں اکثر ان سے ملنے کے لئے ان کے گھر جاتا تھا۔

میرے لندن آنے کے کچھ دنوں بعد ہی ایک فرانسیسی لندن آیا۔ اس کی آمد سے نہ صرف فرانسیسی کالونی بلکہ تمام مہاجرین نے دلچسپی لی۔ ہمارے "سایہ" بین الاقوامی پولیس کو بھی اس سے دلچسپی تھی۔ اس کا نام تھا۔ بارتھیلیے۔ ہم اس کا نام اور رکنسیر جری سے اس کی فرار کی خبر اخبارات میں پڑھ چکے تھے۔ تھوڑا سا نکلتا ہوا قد، گٹھا ہوا بدن، سیاہ چمکدار بال، روشن آنکھیں۔ وہ جنوبی فرانس کے لوگوں جیسا ہی تھا۔ اس علاقہ کے لوگوں کے بارے میں ہمارا جیسا تصور تھا، وہ بالکل ویسا

ہی تھا۔
اس کا سر پر روایتی جکڑ تھا۔ اسے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ کاندھے پر بیڑیوں کے نشان موجود تھے بلانکی کے پیروکاروں نے ۱۸۳۹ء میں پیرس میں جو ناکام بغاوت منظم کی تھی، اس کے دوران صرف سترہ سال کی عمر میں اس نے ایک پولیس والے کو قتل کر دیا تھا۔ فروری ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد کی عام معافی کے بعد وہ پیرس آگیا تھا اور اس نے وہاں پرولتاریہ کی تمام تحریکوں میں حصہ بٹایا۔ اسی سال جون میں ہوئی لڑائی میں اس نے عملی حصہ لیا۔ اسے آخری بیرکیڈ پر گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ گرفتاری کے وقت کسی نے اسے پہچانا نہیں ورنہ دوسروں کی طرح اسے بھی "فوری" طور پر گولی مار دی جاتی۔ جس وقت اسے عدالت کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت تک جوابی تشدد کا دور ختم ہو گیا تھا، اس لئے اسے دوسری سخت سزا دی گئی۔ اسے ملک بدر کر کے فرنچ گیانا (جنوبی امریکہ) کے شہر کیانے بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ (کالا پانی کی سزا۔ ش۔ ف) بعض وجوہات سے اس کے مقدمہ کا حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ جون ۱۸۵۰ء تک کینسر جوئی میں ہی رہا، جب اسے کالا پانی بھیجنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ فطری طور پر اس کی منزل لندن تھی۔ یہاں وہ مارکس اور ہمارے حلقہ میں شامل ہو گیا۔ اکثر مارکس کے گھر پر اس سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

میں نے کئی مرتبہ اس سے "مقابلہ" کیا۔ فرانسیسی مہاجرین نے آکسفورڈ اسٹریٹ کے رتھ بون پیلس میں ایک "تلوار بازی" کا کمرہ بنا رکھا تھا، یہاں تلوار بازی، اور پستول کے ذریعہ نشانہ بازی کی جا سکتی تھی، مارکس، گاہے بگاہے یہاں آکر فرانسیسی مہاجرین سے دو دو ہاتھ کر لیا کرتے تھے۔ وہ مہارت کی کمی کو دوسرے طریقوں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھی تو فرانسیسیوں کو بھی "چکمہ" دے جاتے۔ فرانسیسی تلوار کے سیدھے استعمال کے لئے مشہور ہیں۔ ان کے ساتھ تلوار بازی بہت مشکل ہے، مگر تھوڑی پریکٹس کے بعد ان سے دو دو ہاتھ کئے جا سکتے ہیں۔ بارتھیلمے بہت اچھی تلوار چلانا جانتے تھے۔ انہوں نے پستول سے نشانہ بازی کی مشق کی اور جلد ہی ماہر نشانہ باز بن گئے۔ وہ ویلیچ[1] کی محبت میں پڑے اور مارکس سے نفرت کرنے لگے۔
ویلیچ کے گٹ سے اختلافات نے تلخی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک دن ویلیچ نے مارکس کو چیلنج کیا کہ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ مارکس نے تو اس کا وہی جواب دیا جو انہیں دینا چاہئے تھا، مگر

---

[1] کمیونسٹ لیگ میں ۱۸۵۰ء میں پھوٹ پڑی تھی۔ ویلیچ اور شیپر "بائیں" بازو کے ایڈونچرسٹ گروپ کے لیڈر تھے جنھیں لیگ سے نکال دیا گیا تھا۔

تیز وطرار نوجوان کو نارڈ شرم کو بہت برا لگا اور انہوں نے ویلیچ کی نہ صرف ہتک کی بلکہ انہیں اس کا چیلنج کردیا۔ طے یہ ہوا کہ دونوں میں پستول سے مقابلہ ہوگا۔ یہ مقابلہ بلجیم کے ساحل پر ہونا طے پایا۔ شرم نے اس سے پہلے کبھی پستول کو چھوا تک نہیں تھا۔ جب کہ ویلیچ نشانہ بازی کا ماہر تھا اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے معاون کے طور پر بار تھیلمے کا نام طے ہوا۔ ہمیں شرم کی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔

"مقابلہ" کا دن گذر گیا۔ اس دن ایک ایک منٹ گذارنا مشکل ہوگیا تھا۔ دوسری شام جب مارکس باہر گئے ہوئے تھے اور گھر میں، مارکس کی بیوی اور لنچن تھے، اچانک دروازہ کھلا اور بار تھیلمے آ پہنچا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بڑے دھیمے انداز میں بتایا کہ شرم کے سر میں گولی لگی تھی! وہ پھر جھکا اور چلا گیا۔ شریمتی مارکس کو جو صدمہ پہنچا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ بے ہوش ہوگئیں۔ ایک گھنٹہ بعد انہوں نے ہمیں یہ بری خبر سنائی۔ ہم شرم کی طرف سے مایوس ہوگئے تھے۔ دوسرے دن جب ہم متاسفانہ انداز میں شرم کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ اچانک پھر دروازہ کھلا اور جسے ہم مردہ سمجھ رہے تھے، وہی شرم مسکراتا ہوا ہمارے سامنے تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ سر میں گولی لگنے سے وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ ویلیچ اور بار تھیلمے اسے مردہ جان کر، پہلی کشتی سے لوٹ آئے تھے — شرم نے ان کے بعد دوسری کشتی سے واپسی کا سفر کیا۔

(۱۰)

مارکس اور بچے

ہر صحت مند اور طاقتور انسان کی طرح، مارکس کو بھی بچوں سے غیر معمولی محبت تھی۔ مارکس نہ صرف اپنے بچوں کے مشفق باپ تھے اور ان کے ساتھ گھنٹوں بچہ بن کر کھیلتے تھے بلکہ وہ دوسروں کے بچوں بالخصوص ان بچوں کی طرف بھی مقناطیس کی طرح کھنچے چلے جاتے تھے جو مصیبت کا شکار ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب ہم کسی غریب علاقے سے گذرتے تو وہ ہمیں چھوڑ کر الگ ہوجاتے اور پھر ہم دیکھتے کہ وہ دروازے پر چیتھڑوں میں ملبوس کسی بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ وہ اسے کچھ پیسے زبردستی تھمادیتے۔ مارکس کو بھیک مانگنے والوں سے نفرت تھی کیونکہ انگلینڈ میں بھیک مانگنا باقاعدہ پیشہ بن گیا تھا۔ ابتدا میں وہ اگر پاس میں پیسہ ہو تو مانگنے والوں کو خیرات دے دیا کرتے تھے مگر جلد ہی وہ ان پیشہ ور بھکاریوں کی اصلیت کو جان گئے۔ ان سے خیرات پانے کے لئے کوئی مانگنے والا اگر بیماری یا کسی دوسری مصیبت کا دکھڑا رو کر ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ناراض ہوجاتے۔ وہ انسانی ہمدردی

کے ایسے استحصال کے سخت مخالف تھے اور اسے غریب آدمی کی جیب کاٹنے کے برابر کا جرم سمجھتے تھے لیکن اگر کوئی مرد یا عورت، چھوٹے سے بچے کو اٹھائے ہوئے بھیک مانگتا تو مارکس کا دل پسیج جاتا۔ وہ بچوں کی ملتجی نگاہوں کے مقابلے میں اپنی سختی ترک کر دیتے۔ بچہ اٹھانے والے مرد یا عورت کی نگاہوں کی عیاری کتنی ہی واضح کیوں نہ ہو، وہ اپنے آپ کو نہیں روک پاتے۔ وہ اس بچہ کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور دیدیتے۔

لندن میں عورتوں کا شوہروں کے ہاتھوں پٹنا عام بات تھی۔ مارکس چاہتے تھے کہ ایسے مردوں کو کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ اس معاملہ میں وہ اس قدر جذباتی تھے کہ کہیں ایسا ہوتے دیکھتے تو مداخلت کئے بغیر نہ رہتے۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے ہم مصیبت میں پھنستے پھنستے بچے۔

ایک شام ہم ہیمپسٹیڈ روڈ کی طرف بس سے جا رہے تھے۔ ایک اسٹاپ کے قریب کافی ہماہمی تھی اور اس شور میں ایک عورت کے "قتل، قتل" چیخنے کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ مارکس فوراً بس سے اتر گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے بس سے اترا۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ تو بندوق کی گولی کی طرح سیدھے وہاں پہنچ گئے، جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب سے آگے آگے تھے اور ہمیں لوگ پیچھے سے دھکیل رہے تھے۔ مارکس نے معلوم کیا کہ "معاملہ کیا ہے"۔ بات صاف تھی ایک عورت نشے میں دھت تھی۔ شوہر سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ شوہر اسے گھر لیجانے کے لئے کھینچ رہا تھا۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی اور رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ معاملہ بالکل سیدھا سادا تھا اور ہماری مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر ہماری غیر معمولی دلچسپی کو اس جوڑے نے نوٹ کر لیا تھا۔ ابھی ہم لوٹنے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ جوڑے نے باہمی مفاہمت کر لی اور وہ دونوں مل کر ہمارے خلاف چیخ و پکار کرنے لگے۔ جلد ہی مجمع ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ لوگ ہم "ملعون غیر ملکیوں" کو اس "مداخلت بے جا" پر سبق سکھانا چاہتے تھے عورت نے خاص طور سے مارکس کی سیاہ داڑھی کو اپنے غصّہ کا نشانہ بنایا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اسی وقت دو کانسٹبل آ گئے اور ہماری گلو خلاصی ہوئی۔ ورنہ ہمیں اس "ہمدردانہ مداخلت" کی خاصی قیمت چکانی پڑتی۔ ہم جب تک گھر واپس جانے والی بس پر سوار نہیں ہوئے ہمیں اطمینان نہیں تھا۔ اس کے بعد سے مارکس، ایسے معاملات میں مداخلت کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئے۔

مارکس کی شفقت اور سادگی کا اندازہ کرنے کے لئے مارکس کو اس وقت دیکھنا چاہئے جب وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہوں۔ انہیں کام سے ایک منٹ کی بھی فرصت ملتی یا جب وہ چہل قدمی کے لئے بچوں کو ساتھ لے جاتے، تو ان کے ساتھ خوب دوڑتے اور ان کی پسند کے کھیل کھیلتے۔ ہیمپسٹیڈ ہیتھ پر، وہ بچوں کو لے کر "گھوڑ سواری" کا کھیل کھیلتے۔ ایک بچی کو میں کاندھے پر بٹھا لیتا اور دوسری بچی ان کے کاندھے پر ہوتی۔ پھر اچھل کود اور لمبی ڈور کا کھیل ہوتا۔ اسی دوران ہمارے "سوار"

جنگ شروع کر دیتے۔ یہ پہیلیاں تھیں، مگر لڑکوں سے زیادہ باہمت۔ اس لئے انہیں خوش کرنے کے لئے ہمیں واقعی بہت لمبی لمبی چھلانگیں لگانی پڑتی تھیں۔ جینی جو دونوں بہنوں میں بڑی تھی ۔ ہو بہو اپنے باپ پر گئی تھی۔ اس کی باپ جیسی ہی سیاہ آنکھیں تھی اور پیشانی بھی کشادہ تھی۔ اس پر کبھی کبھی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی گویا اس پر کوئی "روح" سوار ہو جاتی اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں اور وہ بڑبڑانے لگتی کبھی کبھی تو حیرت انگیز اور محیر العقل باتیں کرتی۔ ایک دن ہمپسٹیڈ ہیتھ سے لوٹتے وقت اس پر اس کا دورہ پڑا اور وہ ستاروں پر زندگی کے متعلق بڑبڑانے لگی۔ اس کا لہجہ اور اندازِ تقریر شاعرانہ تھا۔ شریمتی مارکس مادرانہ شفقت میں بے چین ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ "اس عمر کے بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اس کی یہ جنونی کیفیت، خرابیٔ صحت کی علامت ہے" (شریمتی مارکس کے کئی بچے، بچپن ہی میں ہی مر گئے تھے، اس لئے وہ بہت فکر مند ہو گئی تھیں)۔ مارکس نے انہیں برا بھلا کہا، میں نے انہیں اپنی پاٹیتھا کے بارے میں بتایا جو ایسی ہی پیغمبرانہ جنونی کیفیت سے صحت مند ہوا تھا اور اب پوری طرح ہشاش بشاش تھا۔

مارکس کے دونوں بیٹے کم سنی ہی میں مر گئے۔ جو لندن میں پیدا ہوا تھا وہ تو بہت ہی کم عمر میں مر گیا۔ مگر جو برسلز میں پیدا ہوا تھا وہ کافی عرصہ معذور رہنے کے بعد مرا۔ دوسرے بیٹے کی موت مارکس کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ مجھے اس بچے کی بیماری کا آخری غم ناک ہفتہ اب تک یاد ہے۔ یہ بچہ، جس کا نام پراڈگار رکھا گیا تھا مگر جسے "مُش" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ویسے بڑا پیارا بچہ تھا مگر پیدائش سے ہی معذور تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں اور پیشانی اتنی کشادہ تھی کہ اس کا سر، کمزور جسم کی مناسبت سے بہت بڑا لگتا تھا۔ بیچارا مُش کافی عرصہ زندہ رہتا اگر اس کی اچھے سے نگہداشت کی جاتی اور اسے دیہی علاقہ میں، یا سمندر کے کنارے رکھا جاتا۔ مگر مارکس کے لئے وہ بہت مصائب کا زمانہ تھا۔ انہیں ملک ملک بھٹکنا پڑ رہا تھا، لندن میں بھی زندگی اجیرن تھی ، پریشانیاں اتنی تھیں کہ بچے کو بھرپور مادرانہ شفقت بھی نہ مل سکی، اس لئے اس ننھے سے پودے کو جیسی آبیاری کی ضرورت تھی، وہ نہ ہو سکی اور بیچارہ مُش وقت سے پہلے ہی کملا گیا۔ اس کی موت ہو گئی۔

میں اس کربناک منظر کو نہیں بھول سکتا۔ ماں ایک کونے میں بچہ پر جھکی ہوئی سسک رہی تھی۔ لینچن، ان کے بازو کھڑی سسک رہی تھی۔ مارکس اس قدر پریشان حال اور ذہنی کشمکش سے دوچار تھے کہ اگر کوئی انہیں دلاسہ دینے کی کوشش کرتا تو اسے بھی ڈانٹ دیتے۔ دونوں بیٹیاں ماں کے پاس ہی بیٹھی ہوئی رو رہی تھیں، کبھی کبھی ماں ان دونوں بچیوں کو اس طرح سے بھینچ لیتی جیسے انہیں اس موت کے ظالم پنجہ سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ جس نے اس سے اس کا بیٹا

چھین لیا ہے۔

تدفین دو دن بعد ہوئی۔ اس میں میرے علاوہ لیسنر، فینڈر[1]، لوخنر، کونارڈ شرم، ریڈ وولف[2] نے حصّہ لیا۔ میں اسی کوچ میں تھا جس میں مارکس تھے۔ وہ راستے بھر، سر اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے خاموش بیٹھے رہے۔

بعد میں طوسی پیدا ہوئی ہے۔ وہ گیند کی طرح سے گول مٹول، گلاب اور مکھن جیسی نرم و نازک تھی۔ پہلے تو اسے بچہ گاڑی میں لے جایا جاتا تھا۔ پھر وہ ہمارے ساتھ پھدکنے لگی۔ جب میں جرمنی لوٹا تو اس کی عمر چھ سال تھی، گویا وہ میری سب سے بڑی بیٹی سے آدھی عمر کی تھی۔ پچھلے دو برسوں کے دوران وہ اتوار کے دن ہمپسٹیڈ ہیتھ پر مارکس خاندان کے ساتھ چہل قدمی میں شریک رہی تھی۔

مارکس بچوں کے ساتھ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہی ان کے آرام اور تفریح کا سبب تھے۔ جب ان کے اپنے بچے بڑے ہو گئے یا مر گئے تو پھر نواسے نواسیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ جینی جینی جس نے ایک کیونسٹ مہاجر لونگویت سے شادی کی تھی، اپنے باپ کو کئی شریر نواسے نواسیاں دیں۔ سب سے بڑا نواسہ جین یا جانی، جو سب سے زیادہ شریر تھا، اپنے نانا کو سب سے عزیز نواسہ تھا، جو نانا کے ساتھ چاہے جو حرکت کرے، مارکس برا نہیں مانتے تھے۔ نواسے کو بھی نانا کی اس کمزوری کا پتہ تھا۔

ایک مرتبہ جب میں لندن گیا ہوا تھا تو جین بھی وہیں تھا۔ اس کے والدین سال میں کئی مرتبہ اسے پیرس سے نانا کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ بیٹھے بٹھائے اسے خیال آیا کہ اسے نانا کو ٹم ٹم بنا کر اس پر سواری کرنی چاہیے۔ مجھے اور اینگلز کو گھوڑا بنا کر جوتا گیا۔ جین، ٹم ٹم پر یعنی اپنے نانا کے کاندھوں پر سوار ہو گیا۔ اب اس باغ میں یہ سفر شروع ہوا۔ وہ ہمیں نانا کے کاندھوں پر سے ہانکتا رہا۔ یہ شاید میٹ لینڈ پارک کے باغیچہ کا واقعہ ہے یا پھر اینگلز کے گھر میں باغیچہ کا۔ ویسے بھی میرے لئے لندن کے گھروں اور بالخصوص باغوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔ گھر کے آگے چند مربع گز زمین ہوتی ہے جس میں کچھ پودے پھر کائیاں اور گھاس، کائی کہاں ختم ہوتی ہے اور گھاس کہاں شروع ہوتی ہے، یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

"جی ہو" کے نعرے کے ساتھ کھیل شروع ہوا پھر انگریزی میں انٹرنیشنل گایا گیا۔ پھر فرانسیسی

---

[1] کارل فینڈر (۱۸۱۸ء - ۱۸۷۶ء)، جرمن مزدور طبقہ کی تحریک کے سرگرم کارکن، کیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی اور پہلے انٹرنیشنل کی مرکزی کونسل کے ممبر، مصور، مارکس اور اینگلز کے زبردست حامی۔

[2] فریڈینینڈ وولف کی کینیت ۔ کیونسٹ لیگ کے ممبر اور نیور ہنشے زوتنگ کے ۱۸۴۹ء۔ ۱۸۴۸ء میں ایڈیٹر۔

میں حکم اور "ہرا" کا نعرہ۔ مور کو اس وقت تک ٹم ٹم بنا رہنا پڑا جب تک کہ ان کی پیشانی سے پسینہ نہیں ٹپکنے لگا۔ اگر گھوڑوں میں سے (یعنی میں اور اینگلز) کوئی سست پڑتا تو ہمارا گاڑی بان چابک چلاتا اور چلاتا "تم نٹ کھٹ گھوڑو"۔ "چلو"۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک مارکس پسینہ پسینہ نہیں ہو گئے۔ اسے دیکھتے ہوئے ہمیں جانی سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔

(۱۱)

لینچن

جب سے مارکس کا خاندان قائم ہوا تب سے ہی لینچن ان کے گھر کی جان رہی ہے۔ خود مارکس کی ایک بیٹی کا کہنا ہے کہ۔ "انہیں ہی سارا کام کرنا پڑتا تھا اور وہ خوشی سے یہ سب کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کی خوش مزاج تھیں اور مسکراتی رہتیں۔ ہمیشہ مدد کے لئے تیار۔ اس کے باوجود بھی ان میں ناراض ہونے کی صلاحیت تھی۔ وہ مارکس کے دشمنوں سے سخت نفرت کرتی تھیں۔"

جب شریمتی مارکس بیمار تھیں، یا کسی وجہ سے گھر میں نہ ہوتیں تو لینچن ہی بچوں کی ماں کے فرائض انجام دیتی۔ ویسے بھی وہ ان بچوں کی دوسری ماں تھی۔ اس میں زبردست قوت اور خود اعتمادی تھی اگر وہ کسی کام کو ضروری سمجھتی تو پھر اسے پورا کر کے ہی دم لیتی۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا، وہ گھر میں ایک طرح کی ڈکٹیٹر تھی۔ لینچن ڈکٹیٹر تھی اور شریمتی مارکس مالکن۔ مارکس ڈکٹیٹر کے سامنے بھی ایسے ہی ڈرتے تھے جیسے میمنا شیر کے سامنے۔

کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی آدمی اپنے نوکروں کی نظر میں بڑا نہیں ہوتا۔ مارکس تو لینچن کے سامنے بالکل ہی بچے بن جاتے۔ وہ مارکس سے بے انتہا پیار کرتی تھی۔ اگر اسے مارکس پر سو مرتبہ بھی اپنی زندگی نچھاور کرنی پڑتی تو وہ دریغ نہ کرتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی مارکس کے خاندان کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس کے باوجود مارکس اس پر اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتے تھے۔ وہ مارکس کے تمام طور طریقوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھی اور جب چاہتی تو اسے انگلیوں پر نچاتی۔ جب مارکس طیش میں ہوتے اور چیختے چلاتے اور کوئی ان کے قریب جانے کی ہمت نہ کرتا تو لینچن شیر کے پنجرے میں داخل ہوتی اگر وہ اس پر غراتے تو وہ مارکس کو ایسی پھٹکار دیتی کہ پھر شیر، بکری کے بچے کی طرح منمانے لگتا۔

(۱۲)

مارکس کے ساتھ چہل قدمی

ہمپسٹیڈ ہیتھ پر مارکس کے ساتھ چہل قدمی! اگر میں ایک ہزار سال تک بھی زندہ رہوں

توان خوشگوار اور یادگار لمحوں کو نہیں بھول سکتا۔

یہ ہیتھ، پرمروز ہل کے دوسرے طرف ہے اور اسی کی طرح لندن کے باہر سے آنے والوں میں خاصی مقبول ہے۔ آج بھی اس کے بہت سے علاقوں میں کچھ بھی تعمیر نہیں کیا گیا ہے۔ آج بھی یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر مشتمل ہے اور اس پر کوئی بھی بلا خوف و خطر گھوم پھر سکتا ہے۔ آج بھی لندن والوں کی یہ محبوب تفریح گاہ ہے اور اتوار کو تو خوب اژدہام ہوتا ہے۔ عورتوں کی رنگا رنگ پوشاکیں، اس کی دلفریبی میں اضافہ کرتی ہیں۔

یہاں تربیت یافتہ گدھے اور گھوڑے سواری کے لئے ملا کرتے تھے اور عورتیں خاص طور سے اس میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ چالیس سال پہلے ہمپسٹیڈ ہیتھ، بہت طویل تھا اور اس میں اتنا مصنوعی پن بھی نہیں تھا جو آج ہے۔ کسی اتوار کو یہاں تفریح کے لئے جانا، ہمارا سب سے پسندیدہ شغل تھا۔

بچے تو ہفتہ بھر اسی کی بات کرتے تھے اور بڑے بوڑھے بھی بڑی بے چینی سے اتوار کا انتظار کرتے تھے جب ہیتھ کا پروگرام ہوتا۔ وہاں تک سفر بذاتِ خود ایک تفریح تھا۔ بچیاں، چہل قدمی میں خوب دلچسپی لیتی تھیں اور ہرنیوں کی طرح چھلانگیں بھرتی تھیں۔ ڈین اسٹریٹ جہاں مارکس کا خاندان رہتا تھا اور چرچ اسٹریٹ جہاں میرا قیام تھا، ہیتھ تک کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا اور عموماً ہم لوگ گیارہ بجے نکلا کرتے تھے۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا کیونکہ لندن میں عام طور سے لوگ دیر سے سو کر اٹھنے کے عادی ہیں۔ سب کے تیار ہونے اور بچوں کو تیار کر کے بعد روانگی کا سب انتظام کرتے کرتے کافی وقت ہو جاتا تھا۔ ناشتہ دان بھی تو تیار کرنا پڑتا تھا۔

ہمارا ناشتہ دان اب بھی "میری نظروں کے سامنے" گھومتا ہے۔ یہ بڑا اور مضبوط ناشتہ دان تھا اور اسے دیکھتے ہی بھوک چمک جاتی تھی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ابھی میں نے کل ہی اسے لینچن کے ہاتھوں میں دیکھا ہے۔

جب ایک صحت مند اور جوشیلے آدمی کی جیب میں زیادہ دام نہ ہوں تو اس کے لئے غذا ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ ہماری پیاری لینچن یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے غریب مہمانوں کے لئے اچھی خوراک کیا معنی رکھتی ہے۔ یہ لوگ پیسہ کی کمی کی وجہ سے بھوکے رہتے تھے۔ کافی مقدار میں روسٹ اور لندن کے عام سائز سے بڑی جھولی میں خورد و نوش کا دوسرا سامان بھرا ہوتا۔ اس کے علاوہ چائے، چینی اور کچھ پھل بھی ساتھ ہوتے۔ ڈبل روٹی اور پنیر تو ہیتھ پر بھی خریدے جا سکتے تھے۔ گرم پانی، کھانے پینے کے برتن اور دودھ بھی وہاں مل جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مکھن، خربوزے اور دوسری چیزیں بھی وافر مقدار میں ملتی تھیں اور ہر کوئی استعداد کے مطابق خرید سکتا تھا۔

چہل قدمی عام طور سے یوں ہوتی تھی: میرے ساتھ دونوں لڑکیاں ہوتیں۔ میں انہیں کہانی سناتا، جنگلی پھول چن کر یا اچھل کود کے ذریعہ ان کا دل بہلاتا۔ اس کے پیچھے کچھ دوسرے دوست ہوتے۔ سب سے آخر میں مارکس، ان کی بیوی اور اس اتوار کا وہ مہمان جس پر خصوصی توجہ دینی ہوتی۔ سب سے آخر میں لینچن ہوتی اور وہ شخص ہوتا جسے سب سے زیادہ بھوک لگی ہو۔ اسے ہی ناشتہ دان اٹھانا پڑتا۔ اگر ہمارے قافلہ میں زیادہ لوگ ہوتے انہیں مختلف گروپوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ قافلہ کی ترتیب خواہش اور ضرورت کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی تھی۔

ہیتھ پر پہنچتے ہی ہم سب سے پہلے اس جگہ کی تلاش کرتے جہاں ہمارا قافلہ خیمہ زن ہوگا جگہ کا انتخاب چائے اور بیئر کی سہولت کو دھیان میں رکھ کر کیا جاتا۔

ایک مرتبہ، کھانا پینا ختم ہونے کے بعد قافلے کے مرد و زن، اس جگہ کی تلاش میں روانہ ہو جاتے جہاں کچھ دیر لیٹ کر آرام کیا جا سکتا ہو۔ جو لوگ قیلولہ نہیں کرنا چاہتے، وہ راستہ میں خریدے گئے اتوار کے اخبارات نکال لیتے اور سیاست پر بات چیت کرنے لگتے۔ بچے جلد ہی اپنے ہمجولیوں میں جا ملتے اور جھاڑیوں کے گرد چھپنے کا کھیل کھیلتے۔

اس تفریح میں بھی رنگارنگی ہوتی۔ کبھی کشتی ہوتی، کبھی دوڑ، کبھی پتھر پھینکنے اور کبھی دوسرے کھیل منظم کئے جاتے۔ ایک دن شاہ بلوط کا درخت نظر آیا۔ اس میں پھلیاں پک چکی تھیں۔

"چلو آج دیکھیں کون زیادہ پھلیاں گراتا ہے۔" پھر مقابلہ شروع ہو گیا۔ مارکس بھی اس میں شامل رہے اور یہ بمباری اس وقت جاری رہی جب تک آخری پھلی نہ گر گئی۔ مارکس بھی آخر تک، بغیر تھکے اس میں شامل رہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس کا دایاں ہاتھ سوج گیا اور وہ اسے کئی دن تک ہلا نہیں پائے۔ میرا بھی یہی حال ہوا۔

سب سے زیادہ مزا اس دن آیا جس دن ہم نے گدھا سواری کی۔ اس دن ہم نے خوب قہقہے لگائے اور ایک دوسرے سے مذاق کیا۔ اس دن ہماری کیا گت بنی۔ بہر حال پوچھئے مت۔ مارکس کی تو جو حالت تھی اس پر وہ خود بھی خوب ہنسے اور ہمیں بھی ہنسنے کا موقعہ فراہم کیا۔ انہوں نے جس ڈھنگ سے سواری کی، وہ زمانۂ قدیم کے گھوڑ سواروں کی یاد دلاتی تھی اور اس پر ستم، یہ کہ مارکس نے ہم پر اپنی مہارت کی بھی دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔ ان کی مہارت کا قصہ صرف اتنا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے گھوڑ سواری کی تربیت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اینگلز کا کہنا ہے کہ مارکس نے تین دن سے زیادہ سبق نہیں لیا تھا۔ ہاں جب وہ مانچسٹر آتے تھے تو وہ اور ایک تربیت یافتہ گھوڑی پر سواری کیا کرتے تھے۔ مگر ان کا مانچسٹر جانا ہی بہت کم ہوتا تھا۔

ہیمپسٹیڈ ہیتھ پر چہل قدمی ہمیشہ ہمارے لئے مسرت کا سبب ہوتی۔ مگر سابقہ تفریح سے زیادہ

آنے والی تفریح سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہمارے نئے غم کی کمی نہیں تھی مگر ہم اسے اپنی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے ذریعہ کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمیں جلاوطنی کا کوئی غم نہیں تھا، اگر کوئی اس کی شکایت شروع کرتا تو ہم اسے فوراً سماج کے تئیں اس کی ذمہ داریاں یاد دلا دیتے۔

واپسی کے وقت وہ ترتیب نہیں ہوتی جو قافلے کی آمد کے وقت ہوتی تھی۔ بچے، جو دن بھر کی دوڑ دھوپ سے تھک جاتے تھے، وہ سب سے آخر میں لینخن کے ساتھ ہوتے۔ چونکہ ناشتہ دان خالی ہو کر، ہلکا ہو جاتا تھا اس لئے وہ بچوں کی بھی نگرانی کر سکتی تھی۔ اکثر کوئی نہ کوئی گانا شروع کر دیتا۔ ہم کبھی سیاسی گیت نہیں گاتے۔ ہم اکثر لوک گیت جو حب الوطنی کے جذبات سے پُر ہوتے۔ ہمارا سب سے محبوب گیت" اواسٹراس برگ" تھا۔ بچے اکثر نیگر وگیت چھیڑ دیتے اور اگر تھکے ہوئے نہ ہوتے تو اس پر تھرکنے بھی لگتے۔ چہل قدمی کے وقت جس طرح جلاوطنی کے مصائب کا تذکرہ ممنوع تھا، اسی طرح سیاست کا موضوع بھی گاہے بگاہے ہی چھڑتا۔ مگر ادب اور آرٹ کا موضوع اکثر چھڑ جاتا، جس سے مارکس کو موقعہ مل جاتا کہ وہ اپنی حیرت انگیز یادداشت کا مظاہرہ کرتے۔ وہ اکثر "ڈیورین کامیڈی" سے گیت سناتے جو انہیں پوری طرح حفظ تھے۔ ساتھ ہی وہ ہمیں شکسپیئر کے ڈرامہ سے منظر بھی سناتے۔ کبھی کبھی ان کی بیوی ہمیں یہ منظر سناتیں، شکسپیئر کے بارے میں ان کی معلومات کافی تھیں۔

جب ہم کینٹش ٹاؤن اور ہیوراسٹاک ہلز کے مکان میں منتقل ہو گئے تو پھر ہماری تفریح کی آماجگاہ ہمپسٹیڈ اور ہائی گیٹ کی درمیانی پہاڑیاں ہو گئیں وہاں ہم پھولوں اور سبزے کی تلاش کرتے۔ بچوں کو اس سے خاص طور سے دلچسپی تھی جو سرما کی برف اور شہر کے پتھروں کے جنگل سے اوب چکے تھے۔ اس وقت ہماری مسرت کی انتہا نہیں تھی جب ہم نے ایک درخت کے سائے میں پہلی مرتبہ ان نیلے پھولوں کے پودوں کا پتہ لگایا جو" فارگیٹ می ناٹ" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ میں نے ہی بچوں کو پہلی مرتبہ ان جنگلی پھولوں سے روشناس کروایا۔ اس سے زیادہ خوشی ہمیں اس وقت ہوئی جب ہم نے" آگے جانا منع ہے" کے بورڈ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان سبزوں کا معائنہ کیا جہاں خاصی شبنم تھی اور یہاں ہی پہلی مرتبہ ہم نے ارغوانی سنبل دیکھا۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ پھول صرف جنوبی یورپ ــــ سوئٹزرلینڈ، جنیوا جھیل، اٹلی اور یونان میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں امید کے خلاف ہم اپنی آنکھوں سے ارغوانی سنبل کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے انگریزوں کا یہ دعوا صحیح معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک پھول اور سبزے کا تعلق ہے، انگلینڈ کا موسم اٹلی جیسا ہی ہے۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ سنبل ہیں مگر یہ باغ میں اگنے والے سنبل جیسے نہیں تھے بلکہ کچھ نیلاہٹ لئے ہوئے اور باغ کے پھول سے چھوٹے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ٹہنی پر اتنے پھول نہیں تھے جتنے باغ میں ہوتے ہیں۔ مگر ان کی مہک بالکل سنبل جیسی تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی تیز۔

یہاں سے ہی ہم دنیا پر نظر ڈالتے، کہرے کی دھند میں چھپے ہوئے شہر کا نظارہ کرتے۔

(۱۳)

قیامت خیز لمحہ

فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کے عظیم مصنف رابلیاس کے قیامت خیز لمحے کے بارے میں کس نے نہیں سنا ہے کہ اگر اس وقفہ کے دوران بل نہ ادا کیا جائے تو اس سے بھی بدتر مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ کس کی زندگی میں ایسا بدبخت لمحہ نہیں آیا ہوگا؟ میرے ساتھ تو ایسا اس وقت ہوا جب میں اپنی پہلی تقریر کرنے والا تھا۔ اس کے علاوہ جب پہلی مرتبہ جیل کے پھاٹک پر سب کے سامنے جیل کے وارڈر نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اپنی ٹائی اور بیلٹ اس کے حوالے کردوں۔ مجھے بعد میں میرے سوالات کے جواب میں بتایا گیا تھا کہ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ کہیں آپ اپنی جیل کی کوٹھری میں خودکشی نہ کرلیں۔ یہ سب میرے لئے بدبخت لمحے تھے۔ مگر میں جس واقعہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، اس کے مقابلے میں یہ لمحے خوشگوار نظر آتے ہیں۔ یہ وقفہ پندرہ منٹ کا بھی نہیں تھا، زیادہ سے زیادہ سات آٹھ منٹ لگے ہوں گے۔ اس وقت، وقت دیکھنے کا خیال کسے تھا۔ پھر یہ کہ اگر خیال آبھی جاتا تو میرے پاس گھڑی کہاں تھی۔ ایک جلاوطن شخص کے پاس گھڑی! ناممکن ہے۔ مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ یہ وقفہ امر ہوگیا۔ جسے میں فراموش نہیں کرسکتا۔

یہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۲ء کا واقعہ ہے جو لندن میں پیش آیا۔

آہنی ڈیوک اور سینکڑوں جنگ کے ہیرو لارڈ ولنگٹن کا جنھیں اصلاحات کی تحریک کے دوران انگلش عوام نے سپر ڈالنے پر مجبور کردیا تھا۔ ۱۴ ستمبر کو انتقال ہوگیا تھا۔ "قومی اعزاز" کے ساتھ "قومی مجاہدین" کی صف میں اس "قومی ہیرو" کو سینٹ پال کے چرچ میں دفن کیا جانے والا تھا۔ اس کی موت کے دن سے ہی انگریزی عوام اس دن کے بارے میں بات کرنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آہنی ڈیوک کے لئے الوداعی تقریب، ماضی کی تمام ایسی تقریبات کو اسی طرح مات کردے گی جس طرح خود لارڈ ویلنگٹن نے دوسرے قومی مجاہدین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالآخر وہ دن آگیا۔ پورا انگلینڈ متحرک تھا۔ ہزارہا لوگ انگلینڈ کے دوسرے علاقوں سے اور کئی ہزار ملک کے باہر سے آئے تھے۔ اس طرح انسانی سروں کا ایک سمندر بن گیا تھا۔

مجھے ایسی تقریبات اور ایسے ہجوم سے نفرت ہے، دوسرے جلاوطن لوگوں کی طرح میں بھی اس دن گھر میں رہتا یا سینٹ جیمس پارک چلا جاتا مگر میری دو لونوں نے مجبور کردیا۔ ان میں سے ایک جینی تھی جو ہو بہو باپ پر گئی تھی۔ اور دوسری نازک اندام، حسین، کشادہ پیشانی

والی لاورا تھی جو اپنی خوش دل ماں کا عکس تھی۔

ہماری پہلی ملاقات پر دونوں نے مجھے متاثر کیا تھا میں جہاں بھی جاتا وہ مجھے گھیر لیتیں۔ لندن میں جلاوطنی کے دنوں میں مجھے جو کچھ مسرت اور خوشی حاصل رہی اس کے لیے یہ دونوں بہنیں ہی ذمہ دار ہیں اور میں ساری عمر ان کا احسان مند رہوں گا۔ جب کبھی میں اکتا جاتا تو میں اپنی ان چھوٹی چھوٹی سہیلیوں کے پاس چلا جاتا اور ان کے ساتھ سڑکوں اور پارکوں میں مٹرگشتی کر کے اپنے غم کو بہلاتا۔ میں سارا غم بھول جاتا اور مجھے نہ صرف مسرت بلکہ جدوجہد کے لیے نیا حوصلہ اور قوت بھی ملتی۔

اکثر مجھے انہیں کہانیاں سنانی پڑتیں۔ جلد ہی مجھے اچھے قصہ گو کا خطاب مل گیا تھا اور میری آمد پر وہ پرمسرت نعروں کے ساتھ میرا خیر مقدم کرتیں۔ ویسے مجھے بہت سی کہانیاں یاد تھیں مگر جب میرا ذخیرہ ختم ہو جاتا تو میں خود کہانیاں گڑھ لیتا۔

تقریب دیکھنے کے لیے بے تاب لڑکیوں کے ساتھ نکلتے وقت شریمتی مارکس نے مجھ سے کہا کہ

"بچیوں کا دھیان رکھنا۔ جہاں زیادہ بھیڑ ہو وہاں مت جانا۔ جب ہم دروازے سے نکل رہے تو ٹپن دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے چلاّ کر ہدایت کی "لائبریری دھیان سے جانا" (بچوں نے مجھے لائبریری کا خطاب دے دیا تھا)

میں نے پورا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ چونکہ کسی کھڑکی یا اسٹینڈ پر کھڑے ہونے کے لیے قیمت چکانے کے دام ہمارے پاس نہیں تھے اور چونکہ جلوسِ جنازہ اسٹرینڈ سے ہوتے ہوئے دریا کے کنارے کنارے گزرنے والا تھا اس لیے میں۔ نے بچوں کو اس گلی کے نکڑ پر لے جانے کا فیصلہ کیا جو دریا کی طرف جاتی ہے۔

۔بچیاں میرے ہاتھ تھامے ہوئے تھیں۔ میری جیب میں کچھ کھانے کا سامان تھا۔ ہم مقررہ جگہ کی جانب بڑھے جو پرانے شہر کے دروازوں ویسٹ منسٹر اور شہر کے درمیانی ٹیمپل بار سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سارے راستہ پر ہجوم تھا مگر چونکہ جلوس جنازہ مختلف محلوں سے گزرنے والا تھا اس لیے لوگ مختلف جگہوں میں تقسیم ہو گئے تھے اس لیے ہم زیادہ دھکے کھائے بغیر مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ میری پسند کی گئی جگہ اچھی نکلی۔ ہم نے ایک زینے پر قبضہ کیا۔ بچیاں مجھ سے ایک سیڑھی اوپر تھیں لڑکیوں نے ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے سے خود ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھیں۔

وہ کیا ہے؟ ہجوم بڑھ گیا۔ سمندر کی آہستہ خرام لہروں کی طرح سے ہجوم بڑھتا ہوا نزدیک آتا گیا۔ بچے خوش ہو گئے۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ اس لیے مجھے اب تک جو تشویش تھی دور ہو گئی۔

سنہری وردیوں کا جلوس گزرتا رہا اور ہم نے اس وقت تک اس جلوس کو دیکھا جب تک

کہ آخری سوار بھی ہمارے سامنے سے نہیں گزر گیا۔

اچانک ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے لوگ جلوس دیکھنے کے لیے آگے کی طرف بڑھے۔ میں نے اپنے پیر مضبوطی سے جما لیے۔ بچیوں کو بھی اپنے تحفظ میں لینے کی کوشش کی تاکہ ہجوم کا ریلا انہیں نہ ساتھ لے جائے۔ مگر جب عوام کا ہجوم ہو تو پھر کوئی انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے انہیں راستہ دینا ہی پڑا اور میں بچیوں کو تھامے ہوئے پیچھے سرکنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اب ہم بچ گئے مگر اچانک ایک دوسرا ریلا آیا اور ہم دائیں طرف دھکا کھاتے ہوئے اسٹرینڈ پر پہنچ گئے جہاں ہزاروں لوگ جنازہ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ میں نے دانت بھینچ لیے اور بچیوں کو کاندھے پر اٹھانے کی کوشش کی مگر ہجوم تھا کہ ہمیں دھکیل رہا تھا۔ اچانک ایسا لگا کہ جیسے کسی قوت نے مجھے اور بچیوں کو الگ الگ کر دیا۔ میں نے ان سے مل جانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ مجھے بچیوں کا ہاتھ اس خدشہ کے تحت چھوڑنا پڑا کہ کہیں ان کی کلائیاں نہ ٹوٹ جائے۔ میری بدبختی کا وقفہ شروع ہو گیا۔

میں کیا کروں ٹیمپل بار گیٹ میرے سامنے تھا۔ اس میں ایک طرف سواریوں کے لیے راستہ تھا۔ اور دونوں کناروں کے راستے پیدل چلنے والوں کے لیے تھے۔ ہجوم اس طرح گیٹ کی طرف موج زن تھا جیسے دریا میں پانی کی لہریں پل کے ستونوں سے ٹکراتی ہیں۔ چاروں طرف چیخ و پکار تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہو سکتا ہے۔ اگر بچیاں پیروں تلے روندی نہیں ہوں تو وہ مجھے گیٹ کے دوسرے سرے پر جہاں ہجوم کچھ ہوگا مل جائیں گی۔ اس وقت میری دلی تمنا صرف یہی تھی کہ میں جیسا سوچ رہا ہوں ویسا ہی ہو۔

میں کہنیوں اور سینے سے ہجوم کو چیرتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس وقت میں زندگی کی سب سے بڑی اور اہم جدوجہد میں مصروف تھا۔ ایک زوردار دھکا لگا اور میں ایک ریلے کے ساتھ گیٹ کے دوسری طرف پہنچا دیا گیا۔ اب میں ہجوم سے باہر تھا۔ میں نے انتہائی بے تابی سے بچیوں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر۔ میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اچانک دور سے آواز آئی "لائبریری"۔ یہ آواز میرے کانوں میں امرت گھول گئی۔ دوڑ کر بچیوں کے پاس پہنچا اور بے اختیار ہو کر ان کے بوسے لینے لگا۔ ایک لمحہ کو میں گونگا ہو گیا تھا۔ خود انہوں نے ہی بتایا کہ کس طرح جس انسانی ریلے نے انہیں مجھ سے الگ کر دیا تھا، وہی انہیں بہاتا ہوا گیٹ کی دوسری طرف لے آیا اور اسی دیوار کے سایہ میں چھوڑ دیا جو ہجوم کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ تھی۔ انہیں میری یہ ہدایت یاد تھی کہ اگر کسی وقت باہر وہ کہیں مجھ سے الگ ہو جائیں تو اسی جگہ رہیں جہاں وہ ٹھہری ہوئی ہوں۔ ادھر ادھر مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ انہوں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور انسانی ریلے نے انہیں جہاں پہنچا دیا تھا وہ وہیں کھڑی رہیں۔

ہم فتحمندی کے احساس کے ساتھ گھر لوٹے۔ مور، شریمتی مارکس اور ینچن نے ہمارا خوشی خوشی سواگت کیا۔ اس وقفہ کے دوران وہ بہت بے چین رہے تھے۔ انہوں نے سنا تھا کہ ہجوم بہت زیادہ تھا اور بہت سے لوگ کچل کر زخمی ہوئے ہیں۔ بچوں کو اس خطرے کا قطعی احساس نہیں تھا جس سے وہ دوچار تھے۔ انہوں نے تو اسے تفریح سمجھا اور لطف لیا میں نے بھی انہیں نہیں بتایا کہ مجھ پر سے کیا قیامت خیز لمحہ گزرا تھا۔

(۱۴)

مارکس اور شطرنج

مارکس ڈراٹ، کے بہترین کھلاڑی تھے۔ اس میں انہیں ہرانا بڑا مشکل تھا۔ وہ شطرنج بھی کھیلتے تھے مگر اس میں اتنے ماہر نہیں تھے۔ اس کمی کو وہ پرجوش کھیل اور اچانک حملوں کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

چھٹی دہائی کے ابتدا میں ہم جلاوطنوں میں شطرنج کافی مقبول کھیل تھا۔ ہمارے پاس وقت کافی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "وقت ہی دولت" ہے مگر دولت اتنی نہیں تھی جتنا وافر وقت ہمارے پاس تھا۔ اس لئے ہم اپنا وقت' ذہنی مشقت" کے کھیل شطرنج پر صرف کرتے تھے۔ ہمارے قائد ریڈ وولف تھے جنھوں نے پیرس میں شطرنج کے بہترین کھلاڑیوں سے تھوڑا بہت سیکھا تھا۔ اکثر بڑا گرما گرم مقابلہ ہوتا۔ ہارنے والے کو پنالٹی دینی ہوتی، اس لئے مقابلے ہنگامہ خیز اور شور شرابے والے ہوتے۔

مارکس جب کھیلتے وقت مشکل میں ہوتے تو سنجیدہ ہو جاتے اور اگر ہار جاتے تو پھر غصہ دیکھنے لائق ہوتا۔ جب ہم ادلڈ کرمپٹن اسٹریٹ کے ماڈل لاجنگ ہاؤس میں تین تا چھ ہفتوں کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے تو اکثر انگریز ہمارا کھیل دیکھنے کے لئے ہمارے گرد جمع ہو جاتے۔ اس وقت انگلینڈ میں بالخصوص مزدور طبقہ میں شطرنج خاصہ مقبول تھا۔ وہ ہماری لطیفہ گوئی سے بھی محظوظ ہوتے۔ دو جرمن درجن بھر انگریزوں سے زیادہ شور شرابہ کرتے ہیں۔

ایک دن مارکس نے بڑے فخر کے ساتھ ہمیں بتایا کہ اس نے ایک ایسی چال تلاش کی ہے جس کا توڑ کرتے ہوئے سب کا پتہ پانی ہو جائے گا۔ ان کا چیلنج منظور کر لیا گیا۔ پہلے تو انہوں نے ہم سب کو یکے بعد دیگرے مات دے دی۔ مگر ہم نے اپنی شکست کا تجزیہ کر کے چال کا توڑ ڈھونڈ لیا اور پھر دوسری بازی میں، میں نے سب سے پہلے مارکس کو شہہ دی۔ اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی

اس لئے مارکس نے اصرار کیا کہ کھیل دوسرے دن ان کے گھر پر پورا کیا جائے۔

دوسرے دن صبح ٹھیک گیارہ بجے ۔ لندن کے حساب سے خاصی صبح ۔ میں مارکس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ مگر مجھے بتایا گیا کہ وہ جلد ہی آجائیں گے۔ شریمتی مارکس دکھائی نہیں دے رہی تھیں اور لینچن کا موڈ اچھا نہیں تھا۔ ابھی میں یہ معلوم نہیں کر سکا تھا کہ معاملہ کیا ہے، مور داخل ہوئے، انہوں نے ہاتھ ملایا اور سیدھے شطرنج کی بساط نکالی اور جم گئے۔ مقابلہ شروع ہو گیا۔ رات بھر میں مارکس نے نہ صرف شہہ کا توڑ معلوم کر لیا تھا بلکہ تھوڑی ہی دیر میں میری حالت خستہ ہو گئی۔ مارکس نے مجھے شہہ دی اور میں پھنس گیا۔ مارکس خوش ہو گئے۔ انہوں نے کچھ کھانے پینے کے لئے منگوایا۔ پھر بازی شروع ہوئی۔ میں جیت گیا۔ مارکس مختلف انداز اور مختلف موڈ میں کھیلتے رہے۔ شریمتی مارکس کہیں نظر نہ آئیں۔ بچیوں کی ہمت نہیں پڑی کہ قریب آتیں۔ کھیل میں کبھی میرا پلہ بھاری پڑتا کبھی مارکس کا۔ بالآخر، دو لگاتار بازیوں میں، میں نے مارکس کو مات دی۔ انہوں نے کھیل جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ مگر لینچن نے مداخلت کی "بس۔ بہت ہو گیا۔"

(۱۵)

تنگ دستی اور مصائب

مارکس کے بارے میں بہت سے ناقابلِ یقین جھوٹ گڑھے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک جھوٹ یہ بھی ہے کہ مارکس بڑی عیش و عشرت کے ساتھ رہتے تھے جبکہ دوسرے جلاوطنوں کی اکثریت زبردست مصائب سے گذر رہی تھی۔ میں اس وقت تفصیل میں نہیں جانا چاہتا مگر شریمتی مارکس کے نوٹس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مارکس کے خاندان کو جلاوطنی کے عام مصائب سے ہی دوچار نہیں ہونا پڑا بلکہ انہوں نے جلاوطنی کے برسوں میں زبردست مشکلات میں زندگی گذاری۔ ساری مدت ان کا خاندان تنگ دست رہا۔ مارکس کے خاندان نے جتنی مشکلات برداشت کی ہیں شاید اتنی مشکلات کسی جلاوطن نے نہیں جھیلی ہوں گی۔ مارکس کی آمدنی جب بڑھ گئی تھی، اس وقت بھی ان کی زندگی میں قلت برقرار رہی۔ اس زمانے میں بھی ان کی مستقل آمدنی محض وہ پونڈ تھے جو انہیں "نیویارک ڈیلی ٹریبون" میں مضامین لکھنے کے لئے ملتے تھے۔

مارکس کی بیماری اور موت

طوسی کا خط[1]

"(الجزائر) میں مور کے قیام کے بارے میں میں آپ کو یہی بتا سکتی ہوں کہ موسم انتہائی خراب تھا۔ مور کو ایک اچھا اور قابل ڈاکٹر مل گیا تھا اور ہوٹل میں ہر ایک کا رویہ دوستانہ تھا اور انہوں نے مور پر پوری توجہ دی۔

" ۸۲-۱۸۸۱ء کے موسم سرما اور گرما میں مارکس پہلے جینی کے ساتھ ارجنتیولی (پیرس کے قریب) رہے۔ ہم نے وہیں جا کر ان سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ چند ہفتے رہے۔ اس کے بعد وہ جنوبی فرانس اور الجزائر گئے۔ وہاں سے جب لوٹے تو ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ انہوں نے ۱۸۸۲ء کا موسم سرما اور گرما' ونتنور (آئیل آف ویٹ) میں گزارا اور وہاں سے جنوری ۱۸۸۳ء میں جینی کی وفات کے بعد ہی لوٹے۔

"اب کارلس باد کا حال سنیے۔ وہاں ہم پہلی مرتبہ ۱۸۷۷ء میں گئے تھے۔ مور کو جب گردہ اور بے خوابی کی شکایت ہوئی تھی تو انہیں وہاں جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ وہاں کے علاج سے مور کو کافی افاقہ ہوا تھا۔ اس لیے اگلے سال وہ اپنے طور پر گئے۔ ۱۸۷۶ء میں وہاں پھر جاتے وقت انہوں نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پچھلے سال تمہاری کمی بری طرح سے محسوس ہوئی تھی۔ کارلس باد میں مور علاج کے بڑے پابند تھے۔ ان سے جو کچھ کہا جاتا وہی کرتے۔ وہاں ہم نے بہت سے دوست بنائے۔ مور بڑے اچھے ہم سفر تھے۔ وہ ہمیشہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے۔ وہ ہر چیز خواہ وہ کوئی اچھا سا منظر ہو یا بیر کا ایک گلاس' سے لطف اندوز ہوتے۔ تاریخ سے وہ جس قدر واقف تھے، اس کی وجہ سے کہیں بھی قیام بہت دل چسپ ہو جاتا۔ وہ اس مقام کے ماضی اور حال دونوں سے ہمیں آگاہ کرتے۔

"مور کے کارلس باد کے قیام کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس سلسلے میں خاصہ طویل مضمون بھی شائع ہوا تھا مگر کس اخبار میں، یہ مجھے یاد نہیں۔

---

[1] لیبنخت نے یہاں اس خط سے اقتباسات دیئے ہیں جو انہیں مارکس کی سب سے چھوٹی بیٹی الیانور (طوسی) نے لکھا تھا۔

"۱۸۴۷ء میں تم سے لیپزگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں سے ہم بنین گئے۔ مارکس مجھے یہ شہر اس وجہ سے دکھانا چاہتے تھے کہ میری ماں کے ساتھ ہنی مون منانے کے لیے یہیں آئے تھے اسی سفر کے دوران ہم ڈریسڈن، برلن، پراگ، ہمبرگ اور نیورمبرگ بھی گئے۔

۱۸۷۷ء میں مور پھر کارلس باد جانا چاہتے تھے مگر ہمیں پتہ چلا کہ جرمن آسٹریا کے حکام انہیں بے دخل باہر کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ چوں کہ یہ سفر کافی طویل اور خرچیلا تھا اسلیے وہاں مناسب نہیں سمجھا گیا کہ اتنا خرچ کرکے شہر بدری کا خطرہ مول لیا جائے اس کے بعد وہ کبھی کارلس باد نہیں گئے۔ یہ فیصلہ انہیں کافی مہنگا پڑا کیوں کہ وہاں کے علاج کے بعد وہ خود کو بہت صحت مند سمجھتے تھے۔

برلن جانے کا ہمارا بنیادی مقصد مور کے پرانے دوست ہمارے عزیز ایڈگر وان وسٹیفلین سے ملاقات کرنا تھا۔ وہاں ہم صرف دو دن ہی رہے۔ بعد میں ہمیں یہ جان کر لطف آیا کہ تیسرے روز ہماری روانگی کے ایک گھنٹہ بعد پولس ہوٹل میں، ہمیں تلاش کرتے ہوئے پہنچی تھی۔

"۱۸۸۱ء کے گرما تک ہماری پیاری مچن (ماں) اتنی بیمار ہوئی تھیں کہ وہ شاذونادر ہی بستر سے اٹھتی تھیں۔ مور پر پلوریسی کا زبردست حملہ ہوا۔ انھوں نے اپنی بیماری سے جس طرح لاپرواہی برتی تھی یہ اس کا نتیجہ تھا۔ ہمارے دوست ڈاکٹر ڈونکن کا خیال تھا کہ اب کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے لیے یہ سخت آزمائش کا دور تھا۔ ایک طرف بڑے کمرے میں ماں بستر پر تھی اور دوسرے چھوٹے کمرے میں مور۔ حالات کی کیسی ستم ظریفی تھی کہ دو جانیں، جو ایک دوسرے کا جزو بن گئی تھیں، بیماری کی حالت میں ایک کمرے میں بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔"

"ہماری اچھی لنچن — ہمارے خاندان کے لیے لنچن کی کیا اہمیت تھی، اس سے آپ واقف ہیں — اور مجھے ہی دونوں کی تیمارداری کرنی پڑتی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہماری تیمارداری نے ہی مور کو بچالیا۔ اس میں کتنا سچ ہے مجھے پتہ نہیں۔ مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ میں اور لنچن تین ہفتوں تک بستر پر دراز نہیں ہوئے تھے۔ ہم ہر وقت تیمارداری کے لیے مستعد رہتے۔ جب بہت تھک جاتے تو باری باری سے ایک گھنٹہ کے لیے آرام کرتے۔

"مور نے جب کسی حد تک اپنی بیماری پہ قابو پایا تو مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب وہ ماں کو دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں آئے تھے۔ اس وقت وہ دونوں بالکل بیمار بوڑھے نہیں نظر آتے تھے۔ دونوں کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے۔ مچن، ایک نوجوان لڑکی، اور مور ایک عاشق

مزاج نوجوان لگتے تھے۔ بالکل یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ مور خود بہت بیمار ہیں اور ماں موت کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں زندگی سے معمور تھے۔

"اس کے بعد مور صحت یاب ہوئے۔ ایسا لگنے لگا کہ وہ اب پھر پوری طرح سے اچھے ہونے لگے ہیں۔

"۲ دسمبر ۱۸۸۱ء کو ہماری ماں مر گئی۔ ان کے آخری الفاظ ــــ جو حیرت انگیز طور پر انگریزی میں تھے ــــ ان کے پیارے "کارل" کو مخاطب کر کے ادا کیے گئے تھے۔"

"جب ہمارے عزیز جنرل (اینگلز) آئے تو انہوں نے ایک ایسی بات کہی جس سے میں ان پر بری طرح سے برس پڑی۔ انہوں نے کہا تھا:

" ساتھ ہی مور بھی مر گئے۔"

مگر یہ درست تھا۔

جب ہماری پیاری ماں کا انتقال ہوا، مور بھی زندہ نہیں رہے۔ انہوں نے زندہ رہنے کی انتھک جدوجہد کی، آخر کو وہ ایک مجاہد تھے۔ مگر ماں کی موت کے بعد وہ ایک ٹوٹے ہوئے انسان تھے۔ اس کے بعد سے ان کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ اگر وہ خودغرض ہوتے تو وہ خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے مگر ان کے لیے ایک چیز سب سے اعلیٰ تھی اور وہ تھی اپنے آدرش سے وفاداری۔ انہوں نے اپنا کام مکمل کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کے لیے ہی انہوں نے علاج کی غرض سے ایک مرتبہ پھر سفر کرنے سے اتفاق کر لیا۔

۱۸۸۲ء کے موسم بہار میں وہ پیرس اور ارجنتیوئی گئے جہاں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے فی الواقعی جینی اور ان کے بچوں کے ساتھ انتہائی خوشگوار دن گزارے۔ اس کے بعد مور جنوبی فرانس اور الجزائر گئے۔

"الجزائر، نائیس اور کینس کے پورے قیام کے دوران موسم انتہائی خراب رہا۔ الجزائر سے انہوں نے مجھے طویل خطوط لکھے۔ اس میں سے بہت سے خط گم ہو گئے۔ جینی کی خواہش کے مطابق میں نے انہیں جینی کو بھیج دیا تھا مگر اس نے ان میں سے زیادہ تر نہیں لوٹائے۔"

"جب مور گھر لوٹے تو ان کی حالت بہت خراب تھی اور ہم بدترین دن کی آمد کا خدشہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مور نے موسم خزاں اور سرما کے دن ونٹنور میں گزارے۔ یہاں میں یہ بتانا چاہوں گی کہ اس دوران مور کی خواہش کے مطابق میں نے تین ماہ جینی کے بڑے بیٹے جین (جاہنی) کے ساتھ اٹلی میں گزارے۔ ۱۸۸۳ء کی ابتدا میں، میں جاہنی کو لے کر مور کے پاس گئی۔ جاہنی ان کا سب سے چہیتا نواسہ تھا۔ میں لوٹ آنے پر مجبور تھی کیونکہ مجھے کلاس لینی تھی۔

"پھر آخری اور سب سے سخت صدمہ پہنچا۔ جینی کا جو مور کی سب سے بڑی اور سب سے چہیتی بیٹی تھی، اچانک انتقال ہو گیا۔ (اس کا انتقال ۱۱ جنوری کو ہوا) ہمارے پاس مور کا خط آیا تھا۔ وہ خط اب بھی میرے سامنے ہے۔ اس میں مور نے لکھا تھا کہ جینی رو بصحت ہے اور ہمیں (یعنی میں اور ہیلنا) کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مور کا خط ملنے کے ایک گھنٹہ بعد ہی ہمیں جینی کی موت کا ٹیلی گرام ملا۔ میں فوراً وینٹنور کے لیے روانہ ہو گئی۔

میری زندگی میں بہت سے غم گین لمحے آئے ہیں۔ مگر یہ سب سے غم گین وقت تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنے ساتھ باپ کی موت کا پروانہ لے کر جا رہی ہوں۔ راستہ بھر میرا ذہن اسی کش مکش سے دوچار رہا کہ میں کیسے انہیں بتاؤں گی ان کی پیاری جینی اب زندہ نہیں۔ مگر مجھے کچھ نہ کرنا پڑا۔ میرے چہرے نے ہی انہیں بتا دیا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا "ہماری جینی چل مر گئی۔" اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فوراً پیرس جاؤں تاکہ بچوں کی دیکھ بھال میں مدد دے سکوں۔ میں ان کے پاس ٹھہرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ کسی بھی حالت میں راضی نہیں ہوئے۔ میں مشکل سے آدھا گھنٹہ وینٹنور میں رہی اور پھر وہاں سے لندن کے غم ناک سفر کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہاں سے میں پیرس گئی۔ میں وہی کچھ کر رہی تھی جو بچوں کی خاطر مور چاہتے تھے۔

میں گھر واپسی کے بارے میں کچھ نہ کہوں گی۔ میں اس غم ناک اور درد بھرے لمحے کو بھلا دینا چاہتی ہوں۔ میرا غم، میرا درد ان کی کوئی حد نہ تھی۔

"میں اپنی ماں کے بارے میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔ وہ مہینوں تک موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار رہیں۔ کینسر جیسے موذی مرض کی تمام اذیتیں برداشت کیں۔ مگر ان سب کے باوجود ان کی خوش مزاجی اور فطری ظرافت میں کوئی فرق نہیں آیا وہ بچوں کی سی بے صبری کے ساتھ جرمنی کے چناؤ (۱۸۸۱ء) کے نتیجوں کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ فتح کی خبر سے انہیں جو خوشی ہوئی قابل دید تھی۔ موت تک وہ ہشاش بشاش تھیں۔ ہماری تشویش اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے وہ ہمیں لطیفہ سناتی رہیں۔ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ کینسر کی تمام اذیتوں کے باوجود انہوں نے ہمیں لطیفے سنائے۔ انہوں نے ہمارا اور ڈاکٹروں کا مذاق اڑایا کہ آخر ہم اتنے پریشان کیوں ہیں وہ آخری منٹ تک پورے ہوش و حواس میں تھیں۔ جب وہ بات کرنے کے لائق نہیں رہیں تو آخری الفاظ انہوں نے اپنے "کارل" کے لیے کہے تھے۔ ہمارے ہاتھوں کو دبایا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"جہاں تک مور کا تعلق ہے آپ جانتے ہیں کہ وہ میت لینڈ پارک میں اپنے بیڈ روم سے اپنی اسٹڈی میں گئے۔ اپنی آرام کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے آخری سانسیں لیں۔

یہ آرام کرسی "جنرل" کی موت تک ان کے پاس تھی اور اب میرے پاس ہے۔
آپ جب مور کے بارے میں لکھیں تو ہیلن کو نہ بھولیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ ماں کو نہیں بھولیں گے۔ ہیلن ہمارے گھر کا محور تھیں جن کے گرد ہر چیز گھومتی تھی۔ وہ بہترین اور انتہائی وفادار دوست تھیں۔ اس لیے برائے مہربانی آپ جب مور کے بارے میں لکھیں تو ہیلن کو نہ بھولیں۔

"جیسا کہ آپ نے پوچھا ہے، اب میں آپ کو جنوب میں مور کے قیام کے بارے میں کچھ تفصیل لکھوں گی۔ ۱۸۸۲ء کی ابتدا میں مور اور میں نے کچھ دنوں کے لیے جینی کے گھر پر قیام کیا۔ مارچ اور اپریل میں مور الجزائر میں رہے۔ مئی میں وہ مونٹ کارلو، نائیس اور کینس گئے۔ جون کے آخری میں وہ جینی کے گھر لوٹ آئے اور پوری جولائی وہیں رہے۔ لیلن بھی اس وقت جینی کے گھر میں (ارجنتویل) تھیں۔ اس کے بعد وہ لاورا کے ساتھ سوئٹزرلینڈ، وے وی وغیرہ گئے۔ ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے شروع میں وہ انگلینڈ لوٹ آئے اور سیدھے وینٹنور چلے گئے۔ جانی اور میں ان سے ملنے کے لیے وہیں گئے تھے۔
اب کچھ باتیں آپ کے دوسرے سوالوں کے جواب میں، ہمارا رڈگار (مُش) ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوا تھا اور میرا خیال ہے کہ اپریل ۱۸۵۵ء میں اس کی موت ہوئی۔ چھوٹے فاوکس (ہنریچ) کی پیدائش ۵، نومبر ۱۸۴۹ء کو ہوئی اور جب وہ تقریباً دو برس کا تھا[1] میری بہن فرانزسکا کا ۱۸۵۱ میں جنم ہوا اور گیارہ ماہ کی عمر میں وہ مرگئی۔

آپ نے ہماری اچھی ہیلن کے بارے میں جنہیں آخری وقتوں میں "نیم" کے نام سے پکارنے لگے تھے، بعض سوالات کیے ہیں۔ یہ نام جانی لنگوبیت نے اس وقت رکھ دیا تھا جب وہ بچہ تھی۔ اس کی وجہ مجھے معلوم نہیں۔ وہ ہماری نانی وان وسٹفلین کی خدمت میں اس وقت آئی تھی جب مشکل سے آٹھ نو برس کی تھیں۔ وہ مور، ماں اور راڈگار کی خدمت میں ہی بڑی ہوئیں۔ وہ بوڑھی نانی وان واسٹفلین سے بہت محبت کرتی تھیں یہی حال مور کا تھا وہ ہیں

---

[1] اسے "یا رودی سازش" کے ہیرو گے فاوکس کی نسبت سے فاوکس پکارا جاتا تھا ــ (لیبنخت کا نوٹ) ۵، نومبر ۱۶۰۵ء کو گے فاوکس سمیت سازشیوں نے دونوں ایوانوں کے ممبروں اور بادشاہ سمیت، پارلیمنٹ ہاؤس کو بارود سے اڑا دینا چاہا تھا۔

ہمارے نانا بیرن وان واسٹفلین کے بارے میں بتاتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے تھے۔ وہ ہمیں بتاتے تھے کہ نانا کو ہومر کی نظمیں شروع سے آخر تک حفظ تھیں۔ اسی طرح شکسپیئر کے زیادہ تر ڈرامے بھی، انھیں جرمن اور انگریزی، دونوں زبانوں میں حفظ تھے۔ اس کے برخلاف مور کے والد (ہمارے دادا) اٹھارویں صدی کے پکّے فرانسیسی" تھے۔ مور انہیں بھی بہت پسند کرتے تھے۔ جس طرح نانا کو ہومر اور شکسپیئر سے عشق تھا، ویسے ہی دادا کو والٹیئر اور روسو کی تخلیقات ازبر تھیں۔ مور کی ناقابل یقین یادداشت خاندانی ورثہ تھی۔

"اب میں پھر لینچن کی طرف لوٹتی ہوں۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ وہ میرے والدین کے پاس پیرس جانے کے بعد یا پہلے آئی تھیں۔ (یہ لوگ شادی کے فوراً بعد پیرس چلے گئے تھے) مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ ہماری نانی نے انہیں یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ "جو سب سے زیادہ اچھی اور وفادار لڑکی مل سکتی تھی" وہ میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اس کے بعد سے ہی وفادار اور محبت کرنے والی لینچن میرے والدین کے ساتھ رہیں، بعد میں ان کی چھوٹی بہن میرینے بھی ان کے پاس آگئی تھیں۔ یہ شاید آپ کو یاد نہ ہو، کیونکہ یہ آپ کے بعد ہوا ...."

(۱۷)

مارکس کی قبر

اسے اصل میں مارکس کے خاندان کی قبر کہنا چاہیئے۔ یہ قبر ہائی گیٹ قبرستان میں ہے جو لندن کے شمال میں ایک پہاڑی پر واقع ہے جہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے۔

ہم سوشیل ڈیموکریٹک کسی سنت یا اس کے مزار میں عقیدہ نہیں رکھتے مگر ایسے لاکھوں لوگ ہیں جو شمالی لندن کے قبرستان میں آرام کرنے والے شخص کا احترام کرتے ہیں اور اسے یاد کرتے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال بعد جب مزدور طبقہ کو اپنی آزادی کی امنگوں کے اظہار کو روکنے والی تنگ نظری، ماضی کی داستان بن جائے گی، آزاد اور شریف محنت کش عوام کھلے سر اس قبر کے گرد کھڑے ہو کر اپنے بچوں کو فخریہ انداز میں بتائیں گے کہ "مارکس یہاں ابدی نیند سو رہے ہیں۔"

یہاں ہی کارل مارکس اور ان کا خاندان دفن ہے۔ سنگ مرمر سے گھری ہوئی قبر کے سر کی طرف کے حصہ پر تکیہ جیسا ایک پتھر نصب ہے جس پر لکھا ہوا ہے:

جینی وان واسٹفلین، کارل مارکس کی پیاری بیوی، پیدائش ۱۲، فروری ۱۸۱۴ء، وفات ۲، دسمبر ۱۸۸۱ء اور کارل مارکس، پیدائش، ۵ مئی ۱۸۱۸ء۔

میں نے لینچن کو جب پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس کی عمر ۲۷ سال تھی۔ وہ حسین تو نہیں مگر دلکش ضرور تھی۔ اس کے خدوخال اور نقوش بہت دلفریب تھے۔ اس سے کئی لوگ شادی کے متمنی تھے۔ حالانکہ اس پر کوئی دباؤ نہ تھا۔ مگر جس طرح وہ مارکس کے خاندان سے وابستہ ہوگئی تھی اس نے خود مور، شریمتی مارکس اور ان کے بچوں کو چھوڑ نا پسند نہیں کیا۔

وہ ان کے ساتھ رہی اور جوانی کے دن بیت گئے۔ وہ مارکس کے خاندان کے ساتھ خوشی اور غم، دونوں ہی بانٹتی رہی۔ جب تک مارکس کے خاندان کو موت نے نہیں چھین لیا، اس کی زندگی میں آرام نہیں تھا۔ انہیں مارکس کے بعد اینگلز کے گھر میں تھوڑا آرام ملا۔ وہ آخری لمحہ تک خود سے بے گانہ رہی۔ اب وہ مارکس کے خاندانی قبرستان میں آرام کر رہی ہے۔

ہمارے دوست موٹلر "سرخ پوسٹ ماسٹر" جو ہمپسٹیڈ میں رہتے ہیں۔ جہاں سے ہائی گیٹ قبرستان زیادہ دور نہیں ہے مارکس کی قبر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مارکس کی قبر سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے۔ نام اور تاریخوں کا کتبہ بھی اسی پتھر کا ہے میں ایک مرتبہ سوئٹزرلینڈ سے جو سبزہ لایا تھا، گلاب کی جھاڑیاں اور یہاں قبروں کے پاس عام طور سے اگنے والی گھاس، ہی اس قبر کی سادہ آرائش میں مددگار ہیں۔ میں عام طور سے ہفتہ میں دو مرتبہ ہائی گیٹ سے گزرتا ہوں۔ اگر گھاس کافی بڑھ جاتی ہے تو میں اسے صاف کر دیتا ہوں۔ مگر پچھلے دو سالوں جیسی گرمی ہو (اس سال براعظم پر تو خوب بارش ہوئی مگر انگلینڈ میں ایسا زبردست سوکھا پڑا ہے کہ مثال نہیں ملتی) تو پھر معمولی سی آبیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سال تو لیسنر کی مدد کے باوجود ہم قبر کو گرمی کی حدت سے نہیں بچا سکے۔ اس لیے ہمیں قبرستان کے مالی کی خدمات لینی پڑیں کہ وہ باقاعدگی سے پانی دے۔ ایسا ہم نے ایونگس سے مشورہ کرنے کے بعد کیا، جو بہت کم ہی قبرستان جاتے ہیں کیونکہ ان کا گھر یہاں سے بہت فاصلہ پر ہے۔

(۱۷)

پُرانے دَور کی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش

اس سال (۱۹۶۸ء) میں لندن گیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ایک آندولن کار ی ... کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بعد لوٹنے سے پہلے میں شہر کے ان حصوں میں جاؤں گا جہاں ہم مہاجر کی حیثیت سے رہتے تھے اور بالخصوص ان گھروں کو دیکھوں گا جس میں مارکس کا خاندان رہتا تھا۔

وفات ۱۴، مارچ ۱۸۸۳ء، اور ہیری لنگویت، انکا نواسہ، پیدائش ۴، جولائی ۱۸۷۸ء، وفات ۲۰، مارچ ۱۸۸۳ء اور ہیلن ڈیموتھ، پیدائش یکم جنوری ۱۸۲۳ء وفات ۴، نومبر ۱۸۹۰ء۔

مارکس کے خاندان کے تمام افراد اس خاندانی قبرستان میں نہیں دفن کیے گئے ہیں ان کے جن تین بچوں کا انتقال لندن میں ہوا، وہ دوسرے قبرستانوں میں دفن کیے گئے۔ اڈگار (مش) تو یقینی طور پر اور شاید دوسرے دو بھی، وہائٹ فیلڈ چیپل چرچ یارڈ طوطن ہم کورٹ روڈ میں دفن ہیں۔ مارکس کی سب سے پیاری بیٹی جینی ارجنتویلی (پیرس کے نزدیک) میں دفن کی گئی جہاں اسے موت نے اس کے پھلتے پھولتے خاندان سے چھین لیا تھا۔

یہ درست ہے کہ تمام بچے اور نواسے اور نواسیاں اس خاندانی قبرستان میں دفن نہیں کیے گئے مگر خاندان کی رکن، جس کا مارکس سے خونی رشتہ نہیں تھا۔ مگر جو خاندان کی رکن تھی۔ پیاری لینچن، اسی قبرستان میں دفن ہے۔

مارکس اور ان کی بیوی نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا کہ انہیں ہمارے خاندانی قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ لینچن ہی کی طرح اینگلز اور زندہ بچوں نے ان کی خواہش کو اسی طرح سے پورا کیا جس طرح اگر مارکس زندہ ہوتے تو کرتے۔

مارکس کی چھوٹی بیٹی کا خط، جس کا میں پہلے حوالہ دے چکا ہوں اس سے اندازہ لگا یا کیا جا سکتا ہے کہ وہ لینچن سے کتنے پیار کرتے تھے اور اس کی یاد انہیں کتنی عزیز ہے۔

لندن کے اپنے سابقہ دورہ سے واپسی پر میں پیرس سے گزرا تو ڈریویل بھی گیا۔ جہاں لافراگ اور ان کی بیوی لاورا مارکس کا چھوٹا سا خوبصورت گھر ہے۔ وہاں میں "لورچن" کے ساتھ لندن میں بیتے دنوں کی یادداشت میں کھو گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایک چھوٹی سی کتاب ان یادوں کے بارے میں لکھنے والا ہوں تو لاورا نے بھی وہی بات کہی جو طوسی نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "لینچن کو مت بھول جانا۔"

میں لینچن کو نہیں بھولا اور بھول سکتا بھی نہیں۔ وہ چالیس سال تک میری دوست رہی۔ لندن میں جلاوطنی کے دنوں میں اکثر وہی میری "مشکل کشا" بھی تھی۔ اکثر جب میری جیب میں کچھ نہ ہوتا اور اگر مارکس کی مالی حالت اچھی ہوتی تو وہ مجھے چھ پنس دے کر میری مشکل آسان کرتی۔ (اگر مارکس کی مالی حالت بری ہوتی تو وہ کیسے میری مدد کر سکتی تھی۔ کیونکہ مارکس کے ہی پیسے اس کے پاس ہوتے تھے) جب درزی کی حیثیت سے میری مہارت ناکام ہو جاتی تو وہ میرے لیے کچھ ضروری کپڑے بنا دیتیں، جو میری خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے شاید میں کئی ہفتوں تک نہیں خرید پاتا۔

۸ ، جون، سوموار کو میں طوسی مارکس اور اس کا شوہر اولنگ، سیڈن، ہم سے سوہو تو رہے برٹو ٹن ہم کورٹ روڈ کے لیے ریل، ٹیکسی اور ٹم ٹم کے ذریعہ روانہ ہوئے پھر ہم نے پیدل اپنی تلاش شروع کی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اس لن.ن کو کھوج نکالا" جائے جہاں چوتھی دہائی سے چھٹی دہائی تک مہاجرین رہتے تھے۔

ہم ٹوٹن ہیم کورٹ روڈ پر اس مقام پر تھے جو سوہو اسکوائر اور لیسٹر اسکوائر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں جرمن اور فرانسیسی مہاجرین، اپنی غربت اور مفلوک الحالی کے دور میں جذبہ یک جہتی کے تحت اکٹھا ہو گئے تھے۔

پہلے ہم سوہو اسکوائر پر گئے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی مکان، ان پر ایسا ہی روغن۔ حتیٰ کہ بعض دکانوں کے نام اور ان پر لگے ہوئے بورڈ بھی وہی تھے ..... سب کچھ ایک خواب جیسا لگ رہا تھا آنکھوں کے سامنے جوانی کا دور لوٹ آیا۔ چالیس پینتالیس برس دھوئیں کی طرح اڑ گئے۔ میں خود کو پچیس سالہ نوجوان کی شکل میں دیکھنے لگا جو چوراہا پار کر کے ایک مشہور گلی اولڈ کرسٹین اسٹریٹ کی طرف بڑھ رہا ہو۔ وہ پرانا لاجنگ ہاؤس اب بھی اسی طرح موجود تھا جیسے اس زمانے میں تھا جب ہم نے اس میں انتہائی مفلسی کے مگر خوشی کے دن گزارے تھے۔ اس دوران ڈیڑھ نسلیں پروان چڑھ گئی ہیں مگر کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے۔ میں امید کر رہا تھا کہ ابھی ایڈ وولف یہاں سے گزرے گا یا پھر کونارڈ شرم کہیں کھڑا نظر آئے گا۔ سب کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ابھی کل یہاں رہتا تھا۔

کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ گھروں کے اس سمندر میں اب بھی ایسے محلے اور گلیاں موجود ہیں جن کے گھروں پر بیتے وقت کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ گزرتے لمحوں کی لہروں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

ہم آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ پھر چرچ اسٹریٹ پر آ گئے۔ اس روڈ پر وہ چرچ بھی پہلے کی طرح موجود ہے اور اس کے بالکل سامنے وہی پب۔ اس میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ تین منزلہ مکانات جن کی دو کھڑکیاں سامنے کھلتی تھیں، وہ بھی ویسے ہی ہیں۔ ان میں ہی نمبر ۴ امکان ہے جس میں میں آٹھ برس تک رہا تھا۔

ہم پیچھے مڑ کر ایک گلی میں آ گئے۔ یہ میکلس فیلڈ اسٹریٹ ہے۔ مکان نمبر ۶ کہاں ہے۔ یہاں ہی تھا تو پھر یہی ہونا چاہیئے۔ مگر ہماری تلاش بے سود ہے۔ اب یہاں ایک نئی سڑک بن گئی ہے۔ اس لیے وہ مکان بھی کہیں کھو گیا جس میں اینگلز ابتدا میں اس وقت تک رہے جب تک کہ ان کے سخت گیر باپ نے خاندانی تجارت کی نگرانی کے لیے مانچسٹر نہیں بھیج دیا۔

ہم اور آگے بڑھے۔ یہ ڈین اسٹریٹ ہے۔ وہ گھر کہاں ہے جس میں مارکس اور اس کا خاندان برسوں رہا ہے۔؟ میں نے اس سے پہلے بھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوا تھا: بعد میں ہمیں اینگلز نے بتایا کہ یہاں مکانوں کے نمبر تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہاں دکانوں میں امتیاز کرنا ویسا ہی مشکل ہے جیسے دو انڈوں میں فرق بتانا۔ مجھے اپنے لندن کے پچھلے دوروں میں اتنا وقت نہیں ملا کہ میں اسے فرصت سے تلاش کرتا۔ موت سے پہلے میں نے لینجن سے بھی اس کے متعلق دریافت کیا تھا مگر وہ بھی اس کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہی تھی۔ جہاں تک طوسی کا تعلق ہے تو جس وقت مارکس کا خاندان ڈین اسٹریٹ سے کینٹش ٹاؤن کے گھر میں منتقل ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ایک سال تھی۔ اس لیے اسے بھی کچھ یاد نہیں۔

اب ہم نے منصوبہ بند ڈھنگ سے اس مکان کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ اولڈ کرمپٹن اسٹریٹ کے کنارے سے ہم نے دائیں بازو کے کئی مکانوں کے متعلق اندازہ لگایا کہ یہی وہ مکان ہونا چاہیے مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ اس مکان کے بالکل سامنے ایک تھیٹر تھا جو کس مس کیلی کی ملکیت تھا مگر اب یہ تھیٹر بھی از سر نو تعمیر ہو چکا ہے۔ اب وہ کافی بڑا تھیٹر ہے اور اس کا نام رائلٹی تھیٹر ہے۔ وہ پچھلے تھیٹر سے تقریباً دوگنا ہے۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ اسے کس سمت میں بڑھایا گیا ہے اس لیے کسی ایک مکان کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ یہی مارکس کا گھر ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ دو مکانوں میں سے ایک وہی مکان ہوگا جس میں مارکس رہتے تھے۔ حتمی فیصلہ کے لیے مجھے مکان کو اندر سے دیکھنا ہوگا۔ ایک مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو مجھے زینے کچھ مانوس سے لگے۔ مجھے ایسا لگا کہ شاید یہی وہ مکان ہے کیونکہ یہ بہت کچھ ویسا ہی تھا جیسا میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لندن میں ایک قطار کے مکان بالکل ایک جیسے ہی بنائے جاتے ہیں اور ان میں سر مو فرق نہیں ہوتا۔ میں پہلی منزل پر گیا مگر مجھے یہاں کوئی بھی چیز مانوس نہیں لگی۔

اس دوران طوسی اور اس کے شوہر دوسرے حصہ کا معائنہ کر کے لوٹ آئے تھے۔ میں نے انھیں اب تک کی تگ و دو کے متعلق بتایا۔

کیا مجھے دوسرے مکان کے اندر جانا چاہیئے، اس کا نمبر ۲۸ تھا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو شاید یہی مارکس کے مکان کا نمبر تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مارکس کے مکان کا نمبر یاد رکھنے کے لیے میں نے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ ان کے گھر کا نمبر میرے گھر کے نمبر سے دوچند تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اینگلز کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ مکان نمبر تبدیل ہو گئے ہیں۔ کیا ایسا انہوں نے محض مفروضہ کی بنیاد پر کہہ دیا تھا۔؟

ہم نے گھنٹی بجائی، ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا۔ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ اسے

اس مکان کے پرانے مالک مکان اور کرایہ داروں کے بارے میں کچھ پتہ ہے۔

اس نے کہا یاد تو ہے مگر صرف پچھلے نو برسوں کی مدت تک

"کیا میں اندر جاکر مکان دیکھ سکتا ہوں؟"

"یقیناً۔" اور اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دکھایا۔

زینے تو ایسے ہی تھے جیسے میری یادداشت میں تھے۔ گھر کا نقشہ بھی وہی تھا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے زیادہ تر چیزیں بھی مانوس نظر آنے لگیں، پچھلے حصے میں بھی ایسے ہی زینے تھے۔ بالکل ویسا ہی جیسا کہ مجھے یاد تھا۔

بدبختی سے دوسری منزل کے وہ کمرے جہاں مارکس رہتے تھے ان میں تالا پڑا تھا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا یہ وہی مکان تھا۔ یکے بعد دیگرے میرے تمام شبہات دور ہو گئے اور یقین ہو گیا کہ یہی وہ مکان ہے جس میں مارکس رہتے تھے۔

نیچے پہنچتے ہی میں نے کہا کہ "میں نے ڈھونڈ لیا: یہی وہ مکان ہے۔"

یہی وہ مکان تھا جہاں میں نے ہزاروں مرتبہ مارکس سے ملاقات کی تھی۔ اس میں ہی جلاوطنی کی مصیبتوں، مصائب اور تکالیف کو جھیلنے والا مارکس رہتا تھا۔ اسی مکان میں رہتے ہوئے مارکس نے دشمنوں کی شدید نفرت کو برداشت کیا تھا اور اپنی کتابیں ۱۸ ویں برومائیر اور 'ہرووگٹ' لکھی تھیں نیز نیویارک ٹریبون کے لیے مضامین لکھے تھے جو بعد میں "انقلاب اور رد انقلاب" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اسی مکان میں انہوں نے سرمایہ کے لیے زبردست تحقیقی کام کیا۔

ڈین اسٹریٹ کے مکان کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۸۴۹ء میں جب وہ آئے تھے تو پہلے کمبرویل کے مکان میں کچھ عرصہ رہے تھے۔ یہاں بڑے ناخوش گوار حالات میں رہنا پڑا۔ مالک مکان کے دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے قرض دینے والے انگریزی قوانین کے مطابق کرائے داروں کا فرنیچر ضبط کر رہے تھے۔ ڈین اسٹریٹ کے مکان میں منتقل ہونے سے پہلے مئی ۱۸۵۰ء میں جب کہ میں بھی لندن آ پہنچا تھا مارکس لیسیسٹر اسکوائر کے ایک گھریلو ہوٹل میں رہے تھے۔ یہاں وہ سات برس تک رہے اور پھر کینٹش ٹاؤن چلے گئے۔ جو لندن کا ہی حصہ تھا۔ مگر اس وقت تک دیہی علاقہ ہی جیسا تھا۔

اب ہمارے لیے ڈین اسٹریٹ میں کچھ اور دیکھنے کے لیے باقی نہیں تھا اس لیے ہم ٹوٹنہم کورٹ روڈ لوٹ آئے اور ٹرام کے ذریعہ کینٹش ٹاؤن روانہ ہوئے۔

ٹوٹنہم کورٹ روڈ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ پرانی دکانیں بھی اب تک موجود تھیں۔ وہائٹ فیلڈ چیپل یا "ٹیرنکل" بھی ویسا ہی تھا، ہاں اس کا احاطہ ضرور بند کر دیا گیا تھا۔ اسی میں

بے چارہ شش دفن ہے اور اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو وہ دو بچے بھی اسی میں دفن ہیں جو کم سنی میں مر گئے تھے۔

ہم کینٹش ٹاؤن کے قریب پہنچے۔ وہاں مجھے پبلک ہاؤس مانوس سا لگا۔ یہ پُرانا "ریڈرائیڈنگ لیوڈ" میں ہے۔

وہاں تک ہم بس کے ذریعہ گئے اور پھر اتر کر ملڈن میں مڑ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اپنے گھر آگیا ہوں۔ مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ وہاں کچھ ایسی سڑکیں تھیں جو اس وقت نہیں تھیں جب میں لندن سے روانہ ہوا تھا۔ پہلے جہاں میدان تھے وہاں اب مکان بن گئے ہیں۔

اچانک طوسی نے ایک بڑے مکان کی طرف اشارہ کیا جو لندن کے مضاف کے لحاظ سے خاصہ بڑا تھا اور کہا "یہی وہ مکان ہے۔"

یہی وہ مکان تھا جس میں مارکس اپنی وفات سے دس برس پہلے تک رہے تھے۔ دراصل یہ گرافٹن ٹیرس کا کاٹج ہے۔ یہیں وہ بالکونی تھی جس سے جھک کر شریمتی مارکس اپنی بیماری کے دوران اپنی ان تین بیٹیوں سے بات کرتی تھیں جو ان کی بیماری کے دوران میرے پاس رہتی تھیں۔ پہلے وہ کانا پھوسی کے انداز میں بات کرتی تھیں، مگر جس دن میں بچیوں کو لے کر آتا تھا وہ باغ باغ ہو جاتی تھیں۔ پہلے اس مکان کا نمبر ۹ تھا اور اب ۴۶ ہے نمبر ۱

یہاں سے نمبر ۴۱ میٹ لینڈ پارک روڈ کا وہ مکان زیادہ دور نہیں ہے جس میں مارکس کا انتقال ہوا۔ مارکس کا خاندان اس مکان میں ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں منتقل ہوا۔ مکان میں تبدیلی اس لیے ہوئی کہ دو بیٹیوں کی شادی کے بعد یہ مکان انہیں بہت بڑا معلوم ہونے لگا تھا۔ نمبر ۲

ہم خاموشی سے ہیمپسٹیڈ ہیتھ گئے جہاں بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے مگر پرانی بات اب بھی باقی ہے۔ ہم نے پرانے زمانے کی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی اور پھر جیک اسٹراس کیسل میں کچھ کھایا پیا تاکہ واپسی کے تکلیف دہ سفر کے لیے کچھ قوت اکٹھا ہو جائے۔

جیک اسٹراس کیسل! ماضی کے دنوں میں ہم کتنی بار یہاں آئے تھے۔ جس کمرے میں اس روز ہم بیٹھے تھے اسی کمرے میں میں درجنوں مرتبہ مارکس، شریمتی مارکس، بچوں اور لینچن کے ساتھ بیٹھا تھا۔

یہ بہت پرانی بات ہے!

نمبر ۱ : طوسی کا کہنا ہے کہ پہلے یا کم سے کم مارکس کا خاندان جب اس میں منتقل ہوا تھا اس مکان کا نمبر ایک تھا مگر میرا خیال ہے کہ طوسی غلطی پر ہے۔ بہر حال حقائق کا جلد ہی پتہ چل جائے گا۔ (لیبنخت)

نمبر ۲ : اکتوبر ۱۸۵۶ء سے اپریل ۱۸۶۴ء تک مارکس ۹، گرافٹن ٹیرس میں رہے۔ اپریل ۱۸۶۴ء سے مارچ ۱۸۷۵ء تک ۱۔ موڈینا ولاس، میٹ لینڈ پارک روڈ میں رہے۔ اس کے بعد ۴۱ میٹ لینڈ پارک روڈ والے مکان میں منتقل ہوئے جہاں ان کی موت ہوئی۔ ایڈیٹر۔

جینی بنام مارکس

یہ خطوط جینی نے اپنے منگیتر اور محبوب مارکس کو شادی سے پہلے لکھے تھے۔ ان خطوں میں بے وفائی کے طعنوں پر جینی کا لہو سے پُر ردِ عمل ہی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کی رفاقت کے لیے وہ تڑپ بھی پائی جاتی ہے جو دو انقلابی محبت کرنے والوں کے حوالے سے تاریخ کے صفحوں پر ثبت ہو چکی ہے۔ یہ خطوط دو انقلابیوں کی ابتدائی زندگی کے راز دنیاز ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارا انقلابی ورثہ بھی ہیں۔ جنہیں اس کتاب کے لیے صبا حیدر نے ترجمہ کیا ہے — مرتب

بہت ہی پیارے اور صرف میرے محبوب!

سویٹ ہارٹ! اُمید ہے اب تم مجھ سے ناراض نہیں اور نہ ہی میرے بارے میں فکرمند۔ میں تمہیں تفکرات و اضطراب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میری طویل خاموشی کا یہی سبب تھا اور گزشتہ خط لکھتے ہوئے بھی میں اس قدر پریشان تھی کہ میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں تمہیں اس دُکھ اور اذیت سے دور رکھنا چاہتی تھی اور تم نے میری محبت۔ میری وفا پہ شک کیا۔ یوں لگتا ہے۔ میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کے بکھر گیا ہے۔

کارل تم نے کیسے سوچ لیا۔ پھر اتنی سرد مہری سے کیسے لکھ دیا کہ میں بے وفا ہوں اور وہ بھی محض میری طویل خاموشی اور خط لکھنے میں تاخیر کی بنا پر۔ یقین کرو تمہارے پچھلے خط میں اور دیگر باتوں اور واقعات کے بارے میں پڑھنے کے بعد میں اس قدر مفہوم اور رنجیدہ ہوگئی تھی کہ اسے اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس ناقابلِ بیان روحانی اذیت کا سلسلہ تم تک پڑے اور اپنے خاندان کی پاسداری بھی تو میرا فرض ہے۔

آہ! کارل یوں لگتا ہے تم مجھے بہت کم جانتے ہو۔ اور تمہیں میری کوئی قدر و قیمت نہیں۔ کاش تم میرا دُکھ۔ میرا غم جان سکتے۔ اور دیکھ سکتے میرا دل کس قدر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ ایک لڑکی کا پیار مرد کے پیار سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لڑکی اپنے محبوب پر سب کچھ نچھاور کر سکتی ہے۔ سب کچھ اس کا سب کچھ بلا شرکتِ غیرا اپنے محبوب کے لیے ہوتا ہے۔

ایک عام سی لڑکی سے حالات ہیں صرف اپنے مرد کی محبت میں تسکین پا کر اس کے پیار میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ لیکن میرے غیر معمولی حالات اور میری حالتِ زار پر غور کرو کارل۔ پھر بھی تمہاری نظروں میں میرا کوئی مقام میری کوئی قدر و قیمت منزلت نہیں۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تمہارے پیار اور اس کے تقدس کی امین نہیں رہی۔ جب تم نے نہایت سرد مہری لیکن دانشمندی سے تمہید باندھی تھی میں جب ہی سمجھ گئی تھی۔ اور میرے دل کے اندر بہت اندر وہم و گمان نے سر اٹھایا تھا۔

میرا خط تمہارے لیے باعثِ مسرّت ہوا۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ تم مجھے چاہتے ہو اور میرے خواہاں ہو میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ مجھے یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ تمہاری رہائش والا پیپر سے مزین کمرے میں ہے اور وہاں ہیگل کلب ہیں۔ تم نے کولون میں شیمپین پی اور مجھے اپنے خوابوں کی ملکہ بنایا۔ گویا تم میرے ہو۔

ان تمام باتوں کے باوجود تمہارے خط میں ایک کمی رہ گئی ہے۔ میرے دل میں ایک کسک سی اٹھتی ہے کہ تم نے میری یونانی زبان دانی کی تعریف نہیں کی اپنے بیش بہا لمحات میں سے چند لمحے میری علمیت کے اعتراف میں صرف کر لیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ لیکن تم ہیگل کی پیروی کرنے والوں میں سے ہو اس لئے اپنے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والی کسی بھی شئے کو قبول نہیں کرو گے خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ پائے کی ہو۔ لہٰذا مجھے خاموش رہنا ہوگا اور انکساری پر اکتفا پر ہوگا کہ اسی میں میری سرفرازی ہے۔ میں یہ مختصر خط اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے لکھ رہی ہوں کہ نرم بستر اور سنبل کے تکیوں پہ مزید آرام کی ہدایت کی گئی ہے۔ علالت جیسے ناک میں رہتی ہے۔ اتوار کو میں نے ذرا سامنے کے کمروں تک چہل قدمی کی ہمت کی تھی مگر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

شیلنجر نے ابھی ابھی نوجوان انقلابی کے خط موصول ہونے کی خبر سنائی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس خط میں وہ اپنے ہم وطن ساتھیوں سے بدظن ہے اور نامناسب رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ ہم سب اس کے ساتھ ہیں۔ اور اس کے ہر کام میں شریک ہیں۔

میرے محبوب یوں لگتا ہے کہ تم اب سیاست میں ملوث ہو گئے ہو۔ جو کہ نہایت تکلیف دہ اور نقصان دہ ہے۔ پیارے کارل یہ مت بھولنا کہ تمہارے دور افتادہ گھر میں تمہاری محبوبہ مصائب میں گھری ہوئی تمہاری جانب دیکھ رہی ہے۔ اور تمہارے مقدر پہ آس لگائے جی رہی ہے۔ کاش میں تمہیں جلد دیکھ سکوں۔ اور تمہارا قرب حاصل کرسکوں

کلّی طور پر روبصحت ہوئے بغیر مجھے سفر کی اجازت نہیں مل سکتی اِس لیے میں روانگی کی کوئی تاریخ طے نہیں کرسکتی۔ اس ایک ہفتے آرام کروں گی۔ اسی بہانے BRUNO کی کتاب کا مطالعہ کروں گی۔ اس عظیم ہستی سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو اور بات تھی۔ اب تو ... اسے پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔ آج صبح میں نے اخبار میں ہیگل کے تین مضامین اور برونو کی کتاب کا اشتہار پڑھا ہے۔

تمہارا مطالبہ چند سطور کا تھا اور میں نے پورا صفحہ لکھ مارا ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کسی منطق و قوانین کی پابندی سے آزاد ہو کر مطلوبہ سطور کو کئی صفحات پھیلانا چاہتی ہوں۔ میرے محبوب مجھے یقین ہے کہ تم اپنی جینی سے خفا نہیں ہو گے کہ اسی بہانے مجھے چین ملتا ہے اور طمانیت نصیب ہوتی ہے۔

آج میں خالی الذہن ہوں۔ میری حالت قابلِ رحم ہے۔ میرے کانوں میں پہیوں کی چرچراہٹ۔ گھنٹیوں کی صدا اور کارخانوں کا شور سنائی دے رہا ہے۔ لیکن میرا دل تمہاری محبت سے لبریز اور تمہاری چاہت میں سرشار ہے۔ میرے محبوب تمہارے لیے میری محبت بے حساب ہے۔

کیا تمہیں وہاں کی معرفت میرا پنسل سے لکھا ہوا خط موصول نہیں ہوا؟ گویا مجھے کسی توسط سے بھی اپنے آقا کو خط نہیں بھیجنا چاہیے۔ آئندہ میں محتاط رہوں گی اور براہِ راست خط بھیجوں گی۔

کموڈر نیپیئر ابھی ابھی سفید لباس میں ملبوس یہاں سے گزرا ہے۔ ایسے شخص کو صاحب فہم و فراست والی فہرست میں شمار کرنا ممکن نہیں ——

کل پہلی بار والد صاحب کو مقید حالت سے نکال کر کرسی پر بٹھایا جائے گا۔ وہ اپنی صحت کے بارے میں مایوس ہیں پھر بھی نہایت تندہی اور مستعدی سے احکامات جاری کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ عنقریب انہیں کنڈر کی عظیم صلیب

کا تمغہ عطا ہو گا۔

میرے لیے اس سے زیادہ بے بسی کا عالم اور کیا ہو گا کہ رخت سفر باندھ چکی ہوں اور لیٹنے پر مجبور ہوں۔ سب کچھ تیار ہے۔ فراک، ٹوپیاں اور کالر اسکارف وغیرہ مگر پہنے والی کی حالت درست نہیں۔

میرے محبوب میری شب بیداری صرف تم سے منسوب ہے۔ اور میری دعائیں صرف تمہارے لیے ہیں۔ خدا تم پر اپنے رحم وکرم کا سایہ رکھے۔ میں تو ہمہ وقت اس روحانی مسرت دکامرانی کے خواب دیکھتی ہوں جو تمہارے لیے ہو گی۔

آج شام بون کے ڈرامے میں اداکاری کرے گی۔ کیا تم دیکھنے جاؤ گے؟ میں اسے ڈونا ڈایانا کے روپ میں دیکھ چکی ہوں۔

پیارے کارل میں تمہیں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کہنے کو ابھی بہت کچھ ہے۔ مگر ماں اب مزید برداشت نہیں کرے گی۔ وہ مجھ سے قلم چھین لے گی اور میں اس عبادت سے محروم کردی جاؤں گی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی انگلیوں کو بوسہ دے کر اس خط کے ساتھ بھجوا دوں تاکہ وہ تمہارا لمس حاصل کرسکیں۔ اور تم پیار کی سرگوشیوں سے جواب دو۔ لیکن ٹھہرو۔ کچھ اپنی خادمہ کے لیے بھی چھوڑ دو۔ اچھا اب الوداع۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ مزید لکھنے کی تاب نہیں۔ میرے ہمسفر مجھے یقین دلاؤ کہ میں تم سے شادی کرسکتی ہوں۔ خدا حافظ میرے پیارے محبوب۔ خدا حافظ۔

آہ کارل۔ میری اس سے زیادہ اور کیا بدنصیبی ہو گی کہ تم کسی دوسری لڑکی کو بے کراں مسرتوں سے ہمکنار کرو۔ تمہارے جذبات سے لبریز الفاظ تمہارا بھرپور لمس۔ تمہاری تخلیقی والہامی کیفیت کسی اور کے لیے ہو۔ یہ تصور ہی مجھے بے چین ومضطرب کرتا ہے مجھ پر مایوسی ونامرادی کے بادل چھا جاتے ہیں۔ اور مجھے اپنی کمتری اور کم مائیگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ میں تو اپنی ذات کو تمہارے پیار کی مسرتوں کے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ اور یہ سوچ کے وحشت ہوتی ہے کہ تم مجھ سے بچھڑ جاؤ گے یا تمہارا بھرپور پیار سرد مہری میں بدل جائے گا۔

تم خود ہی دیکھ لو کارل، میں تو تمہارے پیار میں پائیداری اور استقامت کی متمنی تھی کہ تمہاری بے رخی نے میری خوشیاں لوٹ لی ہیں۔ اور میں خوش بھی کیسے رہوں

جبکہ مجھے اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہا۔ اس سے زیادہ میرے لیے وحشت ناک اور اذیت ناک بات اور کیا ہوگی کہ تم مجھے بے وفا سمجھو۔

پیارے کارل تم نے محسوس کیا ہوگا کہ اب میں پہلے کی طرح تمہاری ممنون اور احسانمند نہیں رہی اور تمہارے پیار میں مسحور بھی نہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے میری خوشیاں ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھن گئی ہیں۔ اب میرا اعتماد کبھی بھی بحال نہیں ہوگا۔ میں اکثر تمہیں دنیاوی مسائل، حقائق اور ان کی صداقت کا احساس دلاتی رہی ہوں۔ یہ الزام ہوگیا ہے۔ تم جذباتی دنیا میں گم رہ کر حقائق سے دور رہنا چاہتے ہو۔ جذباتی لمحوں میں مغلوب ہو کر روحانی خوشبوں کے حصول میں سب کچھ بھول جانا چاہتے ہو۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ کارل۔ اگر تمہیں میری حالت میرے دکھ کا اندازہ ہوتا تو تم کبھی بھی میری تحریر کو مکروہ یا معمولی نہ کہتے۔ بلکہ اس میں میرے بے لوث پیار اور اس کی انتہاہ گہرائی میں صداقت تلاش کرتے۔

آہ پیارے کارل اگر میں تمہارے پیار کے سہارے رہ سکوں تو میں سلگنا چھوڑ دوں اور میرا دل کبھی خون کے آنسو نہ بہائے۔ خدا گواہ ہے کارل اگر میں تمہارے دل میں اس طرح بس جاؤں جیسا کہ تم میرے اندر ہو تو زندگی بھر میں کسی افسردہ تحریر پر توجہ ہی نہ دوں۔ مگر میرے بھولے فرشتہ صفت محبوب، تمہیں میری قدر و قیمت ہوتی تو مجھ پر اعتماد کرتے۔ تمہارے پیار کی خاطر تو میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔ سب کچھ۔ مگر اب یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا ہے۔ میری شگفتگی و شادابی ختم ہوگئی ہے۔ اور میرے قدم موت کی جانب اٹھ رہے ہیں۔ اگر تم میرے احساسات و جذبات کی گہرائی کو سمجھ لو تو خود بخود تمہاری رسائی میری روح تک ہو جائے گی۔ اور تم ملتفت ہونے پہ مجبور ہو جاؤ گے۔ تم مجھ سے پیار نہ بھی کرو مگر میری حالتِ زار کے پیشِ نظر میری دل جمعی تو کر سکتے ہو۔ فی الحال یہ ہی میری خواہش ہے... آرزو ہے۔

پیارے کارل تمہارا نقطۂ نظر، اندازِ فکر درست سہی مگر پھر بھی میری حساس طبیعت اور غم پرور مزاج کو سامنے رکھ کے جو کچھ جیسے ہوا اسی سیاق و سباق میں دیکھتے تو تم کبھی اتنی بے رحمی و سنگدلی کا مظاہرہ نہ کرتے۔ کاش ایسا ممکن ہو کہ

تم میری جگہ لڑکی بن جاؤ اور وہ بھی میری طرح غیر معمولی اور حساس لڑکی۔ پھر تمہیں سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔

پیارے۔ جب سے تمہارا خط موصول ہوا ہے میں ذہنی اذیت سے دوچار ہوں یہ جان کر مزید دکھ ہوا ہے کہ میری خاطر تم جھگڑے میں ملوث ہو جاؤ گے اور پھر ڈوئل میں بھی۔ رات دن میں تمہیں زخمی حالت میں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ تم بیمار ہو گے۔ سچ سچ بتاؤں؟ اس تصور سے مجھے اگ گونہ خوشی کا احساس ہوا۔ میں بے خودی کے عالم میں سوچتی رہی کہ ڈوئل کے دوران اگر تمہارا دایاں بازو کٹ جاتا تو اچھا ہوتا۔ ایسی حالت میں تمہارے لیے میں ناگزیر ہو جاؤں گی۔ تم میرے بغیر جی نہ سکو گے اور ہمیشہ مجھے اپنے قریب قریب تر رکھو گے۔ اور پیار کرتے رہو گے۔ میں نے یہ بھی سوچا تب میں تمہاری تمام الہامی باتیں سن کر ضبطِ تحریر میں لاؤں گی تا کہ وہ الفاظ لوگوں تک پہنچا سکوں۔ اس تمام عرصے میں تصور رہی تصور میں تمہاری آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ اور میں اسی انہماک سے سنتی رہی جیسے الفاظ کو محفوظ کر کے لوگوں تک پہنچانا ہو۔ تم نے دیکھا میں مستقل تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ اور مستقل تمہارے ساتھ رہتی ہوں۔ کہ تمہارا تصور، تمہاری رفاقت ہی میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہے۔ کاش یہ سب ممکن ہو سکے اور مجھے تسکین مل جائے۔

پیارے جلد از جلد اپنی قربت کی اطلاع دو۔ میں اپنے پیار کی تصدیق چاہتی ہوں اس بار تم سے نہایت سنجیدگی سے تبادلۂ خیال چاہتی ہوں۔ یہ ضروری ہو گیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے میری وفا پر شک کیسے کر لیا۔ میں نے تو کبھی تم پر کسی دوسرے کو فوقیت نہیں دی۔ نہ ہی تم کبھی میری نظروں سے ماند ہوئے ہو۔ یا تمہاری اہمیت کم ہوئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں دوسروں کی خوبیوں کی شناخت کی استطاعت نہیں رکھتی یا تمہیں ناقابلِ تسخیر سمجھتی ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ مگر تمہاری قدر و منزلت کے بیان کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ میں نے تو تم سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ کبھی کچھ نہیں مانگا پھر تم نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔

حیرت ہے میرے ساتھ ایسے شخص کو منسوب کیا گیا جو شاید ہی کبھی تراٹر میں دیکھا گیا ہو۔ جسے کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں سوسائٹی میں گھومتی ہوں اور ہر قسم کے

لوگوں سے بلا تکلف اور بلا جھجک ملتی ہوں۔ گفتگو کرتی ہوں۔ چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتی ہوں میں تو ہر اجنبی سے طویل گفتگو کر سکتی ہوں، گپ شپ بھی لگا سکتی ہوں مگر نہ جانے کیا بات ہے تمہیں دیکھتے ہی میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ میں نروس ہو جاتی ہوں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری رگوں میں خون منجمد ہو کے رہ جائے گا۔ میری روح کانپ جاتی ہے۔ میں تو تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے بھی جذبات میں اس قدر مغلوب ہو کر بدحواس ہو جاتی اور میرے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں۔ میں نہیں جانتی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمہارے تصوّر سے ہی میرے اندر عجیب و غریب احساسات جنم لینے لگتے ہیں۔ تمہارا خیال، تمہارا تصوّر اب میری تمام زندگی پر محیط ہے اور میرے وجود کے ساتھ مل کر اکائی بناتا ہے تمہارے بغیر میں ادھوری ہوں کہ تم میرے حواس پہ چھا چکے ہو۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ تم نے کوئی سوال کیا اور میں شرم و حیا کے مارے گنگ ہو گئی۔ تم نے مجھے بوسہ دیا اور مجھے اپنے قریب تر کیا اور میں کپکپانے لگی۔ میرا سانس رکنے لگا۔ تم نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا، مجھ پر نہایت نرم و گرم نگاہیں ڈالیں اور میں گھبرا گئی۔ تم نہیں جانتے کہ تم میری جانب کیسے دیکھتے ہو۔ اور اس کا مجھ پر کیا اثر ہوتا ہے کاش تم خود ہی جان سکو میں بتانے سے قاصر ہوں میں تو صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی اور تم مجھے اپنی چھوٹی سی بیوی پکارو گے تو تب ہی میں اپنے احساسات کا اظہار کر سکوں گی۔۔۔ اور تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکوں گی شرم و حیا محسوس کیے بغیر۔

ڈیئر کارل یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم میرے محبوب ہو تم اس قدر پیاری باتیں کرتے ہو کہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد آتی رہتی ہیں۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو مگر مجھے یاد ہے اور اس قسم کے الفاظ صرف اسی شخص کی زبان پر آ سکتے ہیں جو مکمّل طور پر کسی کی محبت میں گرفتار ہو۔

میرے شریر محبوب کیا تم سمجھتے ہو میں اپنے جذبات کا مکمّل اظہار کر چکی ہوں، ہرگز نہیں۔ یہ تو صرف اسی صورت میں ممکن ہوگا۔ جب میں تمہاری بیوی بن جاؤں گی۔ بعض باتیں صرف مکمّل خود سپردگی کے عالم میں کہی جا سکتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی مجھے اسی طرح پیار سے دیکھتے رہنا۔

میرے لیے وہ دن کس قدر حسین اور اہم تھا جب میری تم سے پہلی ملاقات

ہوئی تھی۔ تم نے میری جانب دیکھا اور جب میں نے دیکھا تو جلدی سے رُخ موڑ لیا۔ پھر میں نے بھی ایسا کیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کے چہرے پر اس طرح مرکوز ہو گئیں کہ پھر ہم کسی دوسری جانب دیکھ ہی نہ سکے۔

میری صحت کے بارے میں ہرگز متفکر مت ہونا۔ اب بہت افاقہ ہے۔ دوا پابندی سے کھانے لگی ہوں۔ بھوک میں بھی اضافہ ہو گیا ہے کے باغ میں چہل قدمی بھی کرتی ہوں اور تمام دن مستعدی سے کام کرتی ہوں۔ البتہ ابھی مطالعہ نہیں کر سکتی۔ کاش میرے پاس کوئی ایسی کتاب ہوتی جسے میں سمجھ سکتی اور دل بہلا سکتی۔ میں ایک گھنٹے میں بمشکل ایک صفحہ پڑھ سکتی ہوں وہ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ یقیناً دوبارہ روانی ہو جائے گی۔ مجھے چیزوں کو قبول کرنے۔ اپنی گرفت میں لینے کا عبور جلد حاصل ہو جاتا ہے۔ مجھے اُمید ہے میں کتنی بھی پیچھے رہ جاؤں تم آگے بڑھنے میں میری مدد کرو گے۔ اگر ہو سکے تو مجھے کوئی عملی و ادبی کتاب بھیجو۔ ایسی کتاب جسے ہر کوئی پڑھنا پسند نہ کرے۔ خواہ وہ میری فہم و فراست سے بلند تر ہو تب بھی اسے پڑھنا چاہوں گی۔ تھوڑا بہت تو سمجھ میں آ ہی جاتا ہے۔ ذہنی مشق ہونا نہایت ضروری ہے۔ صرف ہاتھوں سے کام کرتے رہنے سے ذہن کند ہونے لگتا ہے۔ پریوں کی کہانی یا شاعری کی کتاب ہرگز نہ بھیجنا۔ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا۔

ڈیئر کارل میری خاطر اپنا خیال رکھو۔ تمہاری عجیب و غریب ننھی محبوبہ تم سے دور زندگی بسر کر رہی ہے۔ تمہارے اندر تبدیلی آئی ہے میں خوش ہوں۔

۱۸ مارچ ۱۸۴۳ء کروز نچ :

اگرچہ گزشتہ ملاقات میں ہم دو طاقتوں نے کسی بھی امر پر قول و اقرار نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کوئی ایسا معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے خط و کتابت میں پہل کی مجبوری یا پابندی ہو لہٰذا کسی بھی بیرونی دباؤ یا جبر کا سوال یا وجود ہی پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ میرے اندر خوب صورت و نازک احساسات کے ارتعاش نے خود بخود مجھے قلم پکڑنے پر اُکسایا۔ میں دل کی اتھاہ گہرائی اور پیار کی صداقت میں تمہاری لازوال محبت کی ممنون ہوں کہ تم اور صرف تم ہی میرے محبوب ہو۔

اس بار مجھے یوں محسوس ہوا کہ تم میرے لیے کہیں زیادہ قابلِ ستائش

اور مسحور کن شخصیت بن گئے ہو۔ گو اس سے پہلے بھی تمہارے جانے کے بعد میں تمہارے ہی سحر میں گرفتار رہی ہوں اور یہ ہی چاہا کہ تم واپس آؤ تو دل کھول کر اظہارِ محبت کروں اور تمہیں بتاؤں کہ میں صرف اور صرف تمہیں چاہتی ہوں۔

البتہ اس بار تم فاتح کی حیثیت سے رخصت ہوئے ہو۔ تمہاری قربت اور پیار کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ تم اپنی عدم موجودگی کے باوجود بھی میرے حواس پہ اپنی تمام تر ملکوتی صفات و محبت کے ساتھ لیے چھائے رہتے ہو۔ تمہارا وجود مکمل اور واضح طور پہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔

پیارے کارل کاش اس وقت تم میرے قریب ہوتے اور اپنی چھوٹی سی مگر بہادر لڑکی کی مسرّتوں کی وسعت دیکھ سکتے۔ اور اس وقت اگر تم کسی شریر ارادے سے میری جانب جھکتے تو بھی میں مدافعتی چارہ جوئی نہ کرتی۔ نہایت اطمینان سے خود کو اپنے شریر غنڈے کے حوالے کر کے سر جھکا لیتی۔

کیا؟ کیسے؟ روشنی۔ کیسی روشنی۔ مجھے سب یاد ہے۔ وہ دھند میں ہماری سرگوشیاں۔ گیس گیم۔ وہ پُر لطف و پرکیف و آرام دہ لمحے سب یاد ہیں۔ تم کس قدر اچھے۔ چاہنے والے اور مسرّت دینے والے محبوب ہو۔

تمہارا چہرہ دمکتا ہوا۔ تمہارا وجود نصرت سے ہمکنار اور میرا دل مستقل تمہارے قرب سے سرشار، اور تمہاری چاہ میں دھڑکتا ہوا، وصل کی گھڑیوں کے لیے بے چین سحر زدہ منتظر۔

پاپا اردج۔ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوتی ہوں

کبھی تمہارے آگے اور کبھی تمہارے پیچھے چلتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ کاش میں تمہاری ہر راہ ہموار کر سکوں اور تمہارے راستے کی ہر رکاوٹ دور کر سکوں مگر قضا و قدر کے کاموں میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں۔ امّاں حوّا کے گناہ کی پاداش میں انسان کو زمین پر مجبورِ محض بنا کر پھینک دیا گیا۔ اب سوائے آس۔ انتظار اور صبر و تحمل کے کیا چارہ ہو سکتا ہے۔

ہمیں حاسدوں سے محتاط رہنا ہوگا اور اپنی اہم اشیاء کو ان کی دسترس سے دور رکھنا ہوگا۔ یعنی اپنی سوئی۔ سلائی اور چابی کی خود حفاظت کرنا ہوگی۔ بطورِ خاص جبکہ ابھی کے طباعت و پباشنگ کے مراحل زیرِ غور ہوں۔

کیا کسی خاتون کی غیر محسوس دخل اندازی اور دیٹو پاور اس سلسلے میں معمولی (چھوٹا) مگر

اہم کردار ادا کر سکتی ہے؟

آج شام میرے ذہن میں کے بارے میں ایک ہلکا سا خیال آیا تھا۔ اگر تم نے اس طرح جرمنی سے فرانس کی جانب وفاداری منتقل کر لی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری وطن میں واپسی ممنوع قرار دے دی جائے۔ یا لبرل حکومت مکمّل طور پر نقلِ مکانی کا حکم نافذ کر دے۔ یا کہے کہ تمہیں ریاست کا دستور پسند نہیں تو دور رہو۔ لیکن یہ سب جیسا کہ میں نے لکھا ہے محض ایک وہم یا خیال ہے۔ ہمارے دیرینہ دوست کو یقیناً علم ہو جائے گا کہ کیا ہونا چاہیئے۔ خاص طور پر جبکہ تمہاری چوزہ نما دوست بیک گراؤنڈ میں گھات لگائے حالات کا جائزہ لے رہی ہو۔ اور علیحدہ عرضداشت کے لیے تیار بیٹھی ہو۔ لہٰذا تمام مسائل باپ ابراہیم کے رحم وکرم پہ چھوڑ دینے چاہیں۔

آج صبح جب میں تم چیزیں درست کر رہی تھی اور مسودے کو دیکھ رہی تھی سگار کے باقی ماندہ ٹوٹے اکٹھے کر رہی تھی اور راکھ جھاڑ رہی تھی اور بہت سارے غیر ضروری کاغذات تلف کر رہی تھی کہ میری نگاہ مذکورہ صفحے پر پڑی۔ تم نے گویا ہمارے دوست کو نکال دیا اور نہایت اہم صفحہ یہیں چھوڑ دیا۔ اگر تم پڑھ کر قصداً چھوڑ گئے ہو تو عجلت کی ضرورت نہیں لیکن اگر اسے جلد ہونا ہے تو جلد ساز کے ہاں پہنچانا اشد ضروری ہے میرا خیال ہے تم نے کچھ صفحات بکھیر لیے ہیں جو کہ تمہارے لیے باعثِ وبالِ جان بن گئے ہیں پھر بھی اپنے بے ترتیب صفحات پر نظرِ ثانی کر لو۔

اب میں تمہیں اپنی تشویش اور مصیبت کے بارے میں بتاؤں۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد میری نظر دستی رومالوں پر پڑی جو تم یہیں چھوڑ گئے۔ مجھے بہت تشویش ہوئی کہ تم نے اپنی ناک کو موسم کی شدت اور مقدر کے رحم وکرم پہ ڈال دیا ہے۔ اس خیال نے مجھے پریشان اور اداس کیئے رکھا۔ اس کے علاوہ ایک اور پریشان کن واقعہ پیش آیا۔ بار بر آیا تو میں نہایت خوش خلقی سے پوچھ بیٹھی کہ ڈاکٹر H-۱ پر تمہاری کتنی رقم واجب الادا ہے۔ جواب تھا ۷ ½۔ میں نے سوچا ½/۲ کی بچت ہو رہی ہے لہٰذا ۸ گروس یہ سمجھ کر کے دے دیئے کہ باقی واپس کر دے گا مگر اس نے تمام رقم جیب میں ڈالی اور شکریہ ادا کر کے چلتا بنا۔ میں منہ دیکھتی رہ گئی۔ میری ماں صبر کی تلقین کے سوا اور کیا کہتی۔ قصہ مختصر چھ کسی اچھی چیز کی طرح ہاتھ سے نکل گئے۔

اب میرے لباس کے بارے میں سن لو۔ صبح میں نے وولف شاب سے لیس کے لیے

سے نئے ڈیزائن دیکھے تھے۔ اگر تمہیں وہاں سستے داموں دستیاب نہ ہوں یا کوئی تمہارے لیے تلاش کر کے نہ لاسکے تو پھر یہ مجھ پر چھوڑ دو پیارے۔ دراصل میں چاہتی ہوں کہ تم ان چیزوں پر رقم ضائع نہ کرو بلکہ کرائے کے لیے رقم بچا کر میرے پاس آجاؤ۔ پھر میں تمہاری رفاقت میں خریداری کروں گی۔ ایسے میں ہمیں اگر کوئی دھوکہ بھی دے گا تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوں۔ یہ ہی فارمولا پھولوں کے لیے ہے مجھے ڈر ہے کہ تم وہاں مہنگے خرید لوگے۔ لہٰذا ہم اکٹھے بازار جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود بھی، میرے محبوب، اگر تم پھول خریدنے پر اصرار رہی کرتے ہو تو پھر گلاب رنگ خرید لینا جو کہ میرے سبز لباس کے ساتھ اچھے لگیں گے۔ مجھ سے چرچ میں شادی کرنے کے بعد پھول وغیرہ خرید دو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ یعنی میرے قانونی شوہر بننے کے بعد۔

اور ہاں ایک اور بات ہے۔ میرا پچھلا خط غور سے پڑھو۔ میرا خط کسی اور کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہیئے ورنہ میں خفا ہو جاؤں گی۔ اس کا جھکاؤ اور ارادہ نیک نہیں بلکہ مائل بہ خیانت ہے۔

جب تم اندر داخل ہوئے تو کیا تمہیں بھگوڑا قرار دے دیا گیا تھا؟ یا انھوں نے انصاف اور رحم میں کوئی فرق نہیں کیا؟ کیا واپس آگیا ہے؟ کیا ابھی بھی غصے میں ہے؟ کیا تم نے بُری خبر والا خط E کو پہنچا دیا ہے؟ کیا پاسپورٹ والے رضامند ہو گئے ہیں۔؟

پیارے! یہ سب تو ضمنی سوالات تھے۔ اب میں اصل مسئلے کی جانب رجوع کرتی ہوں یعنی سٹیمر میں تمہارا سلوک یا برتاؤ کیسا تھا؟ یا پھر کوئی مس ہرمن جیسی تمہاری شریکِ سفر تھی بشر یہ رٹرکے میں یہ سب تمہارے اندر سے نکالوں گی۔ آخر ہر بار ہی کیوں ـــ اس قسم کی آوارہ گردی پر پابندی اور اس قسم کے سنگین جرائم پر سخت سزا دلاؤں گی۔ شادی کے کاغذات پر اس قسم کی آوارہ گردی پر پابندی لگاؤں گی۔ اور ایسے واقعات کی نشاندہی ...... کر کے ان پر سخت سزا دلاؤں گی۔ اور میں عقدِ ثانی کے سلسلے میں قانون بناؤں گی۔ جسے تعزیرات کی کتاب میں شامل کروں گی۔ اور میں ایسا کر دکھاؤں گی۔

کل شام میں بہت تھک گئی تھی۔ پھر بھی میں نے ایک انڈا کھایا۔ اشیائے خوردنی بھی دن بدن مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جب تک تم آؤ گے۔ حکومت قیمتیں کم کرانے کے سلسلے میں مداخلت یا مدد کرے گی۔

اچھا خدا حافظ۔ اگرچہ رخصت ہونا اذیت ناک ہے۔ اور دل دکھتا ہے پھر بھی ....
خدا حافظ میرے اور صرف میرے محبوب۔ کالے پیارے۔ مُنّے سے شوہر۔ ہاں۔ بے
شک تمہارا شریر بدمعاش سا چہرہ میری نظروں میں ہے۔ خدا حافظ۔ مجھے جلدی
خط لکھنا۔ ٹاٹا — ٹاٹا۔ جینیجے

جینی وان ۱۸۷۰ء میں

مصنّف ویلہلم لیبخنت اپنی بیوی طوسی کے ساتھ